جلد 5 شمارہ 11 جنوری 2004ء ذوالقعدۃ 1424ھ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔



عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاح آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 491

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف وکرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب وعرفان اور اسکی رضا ولقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اورادو اذکار کی تلقین۔
- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم ورضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل وعیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ



بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاری** رح

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 5 شمارہ 11 جنوری 2004ء ذوالقعدہ 1424ھ

قیمت ———— -/20 روپے　　سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:0431-862835

Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اوران سب لوگوں کے عقیدہ کی مطابق جو خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں اور خدا کی صفات کا کوئی نہ کوئی تصوران کے اندر پایا جاتا ہے وہ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالے نے اس دنیا کی شقاوت اوراس کا بناؤ بگاڑ اس کی خوش خالی اوراس کی بربادی سب کوانسان کے ساتھ وابستہ کیا ہے انسان اگر اچھا ہے تو دنیا اچھی ہے اور اگر انسان بگڑا ہوا ہے راستہ چھوڑ چکا ہے خودکشی پر آمادہ ہے تباہی و بربادی پر کمربستہ ہے اس کو قیمتی قیمت معلوم نہیں وہ خدا کو بھول چکا ہے اوراس کے نتیجہ میں اپنے کو بھی بھول چکا ہے اس کو اپنے آغاز وانجام کی خبر نہیں یا فکر نہیں تو بھراس دنیا کے بگاڑ کو کوئی روک نہیں سکتا اوراس بگڑی ہوئی دنیا کو بنا نہیں سکتا اللہ تعالی کی ذات غنی ہے وہ انسان کامحتاج نہیں لیکن اس نے ایک قانون مقرر کر دیا یہ سنت الہی کبھی تبدیل نہیں ہوتی ولن تجد لسنّت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنّت اللہ تحویلا) قرآن شریف میں بار بار یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالے نے جو قانون جس کے لئے بنا دیا جس میں جوخواص رکھ دیئے ہزاروں لاکھوں برس گزر جانے کے بعد بھی خواص ان کے اندر پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیی کا قانون اس طرح سے جاری وساری اور کارفرما ہے جیسے ہزاروں برس پہلے تھا اللہ تعالے نے اپنی حکمت بالغہ سے اپنے ارادہ واختیار سے اپنی قدرت سے دنیا کی سعادت وشفاقت کو انسان کے ساتھ وابستہ فرمایا خدا کا یہ قانون ہی کہ یہ دنیا انسان کے دم سے ہے انسان اچھا ہے تو دنیا اچھی ہے انسان اگر برا ہے تو دنیا فساد جا گہوارہ ہے آپ اگر تاریخ میں اس کا سراغ نلگائیں گے اور تاریخ کی تاریکیوں میں دور تک جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کا بگاڑ انسان سرچشمہ ہے دنیا کی تباہی وہلاکت کا اس لئے اصل چیز جس پر محنت صرف کرنے اور توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ انسان ہے اللہ تعالی نے انبیاء علیہم السلام کی صحیح تربیت فرمائی اوران کو مامور فرمایا ان کو اللہ تعالے جو عقل سلیم اور نبوت کا نور عطا فرمایا اس کی روشنی میں انھوں نے اس حقیقت کو پالیا کہ اس دنیا میں جو کچھ ان کے کرنے کا کام ہے وہ انسان کی درستی ہے اور انسان کی ہدایت ہے راستے کو سمجھ لینا اوراس پر اپنی طاقت اور صلاحیتوں کو لگا دینا ہے۔

والسلام وحید احمد

معاملات اور اخلاق و آداب

خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

گھر سے باہر

گھر سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلا واسطہ پڑوسیوں سے پڑتا ہے پھر اہل محلّہ سے اس کے
بعد اہل شہر، اہل ملک اور پھر اہل عالم سے اس لئے ماں باپ، خاص رشتہ داروں، یتیموں اور
مسکینوں کے بعد سب سے پہلا حق پڑوسیوں کا ہے۔ چنانچہ سورۃ نساء میں پڑوسیوں سے نیک
سلوک کرنے کا حکم دیا ہے خواہ رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ سرکار دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ "وہ
شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو جائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے" یہ بھی حضور ﷺ ہی کا ارشاد ہے
کہ "وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کا ہمسایہ اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو" اگر ان
ارشادات پر عمل کیا جائے تو معاشرے کی حالت چند ہی ماہ میں کچھ سے کچھ ہو جائے لیکن افسوس
ہے کہ ہمسائے تو درکنار آج کل تو سگے بھائیوں میں بھی وہ سلوک نہیں ہے۔ جس کا حکم پڑوسیوں
کے لئے دیا گیا ہے۔ اسلام اور ایمان کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص اپنے پڑوسیوں کے دکھ درد اور راحت
وخوشی میں شریک ہو تاکہ محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا ہوں۔ ہر شخص کو چاہیے کہ نہ صرف
پڑوسیوں بلکہ محلے کے تمام آدمیوں سے اکثر و بیشتر ملتا رہے تاکہ سب ایک دوسرے کے حالات
سے واقف رہیں تو بہت اچھا ہے ورنہ محلے کی مسجد میں تو ملنا ہو ہی سکتا ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ
اجتماعیت کی جو روح مسلمانوں میں بیدار کرنا چاہتے ہیں وہ اس طریقہ سے بوجوہ احسن بیدار
ہو سکتی ہے۔

اہل شہر کے آپس میں ملنے جلنے اور تمام شہر کی حالت سے باخبر رہنے کے لئے مساجد جامعہ
بہت کچھ مفید ہو سکتی ہیں۔ ان مساجد میں مروجہ خطبوں کے علاوہ اگر شہر کی حالت پر بھی امام اور
خطیب صاحبان کچھ بیان کیا کریں اور نماز کے بعد ضروری امور پر جلسے ہوا کریں تو شہری زندگی
سے حقیقی دلچسپی اور شہریت کی روح اہل شہر میں بہت جلد پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص پر واجب
ہے کہ وہ شہر کی حالت سے باخبر رہے اور شہر کی ترقی میں دلچسپی لے، کیونکہ شہر کی عام حالت کا اثر ہر
شہری پر بالواسطہ ضرور پڑتا ہے اور تمام شہریوں میں یہ روح بیدار ہو جائے تو تمام قوم میں اتحاد و
یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ شہر کی ترقی کے لئے بلدیات بہت ہی مفید ادارے ہیں۔ ان میں صحیح اور
مخلص قسم کے نمائندے بھیجنے چاہئیں۔ بلدیات کے قواعد و قوانین کی پوری پابندی اور حرمت کرنا

چاہیے اور بلدیات کی املاک کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کی حفاظت کرنا ہر شہری کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔ اور کسی چیز کو کبھی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ شہر کی تفریح گاہوں، باغات، پارکوں، پانی کے نلوں اور ذخیروں، بڑی بڑی شاہراہوں اور گلی کوچوں کی روشنی اور صفائی کے انتظامات اور وسائل کے تحفظ کا بڑا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کو نقصان پہنچانا یا گندا کرنا خلاف انسانیت و شرافت ہے۔ اور ایسا کرنے والے نیم وحشی اور غیر مہذب ہیں۔ شہر میں جو پردیسی آئیں ان کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا اور ضرورت کے وقت حسب توفیق ان کی مدد کرنا بالکل اسلامی تعلیم اور منشاء خداوندی کے مطابق ہے۔ کبھی بھولے بھٹکے کو راستہ بتانے یا منزل مقصود تک پہنچا دینے میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی لیکن جس پردیسی کے ساتھ تم یہ سلوک کرو گے وہ ہمیشہ تم کو نیکی سے یاد کرے گا۔ اور تمہارے شہر کی تعریف میں رطب اللسان رہے گا۔ محتاج پردیسیوں کی روپیہ پیسے سے مدد کر دینا کسی پردیسی کا علاج کرا دینا یا اس کو ہسپتال میں داخل کرا دینا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ انہی باتوں سے قوم کی تہذیب یا بدتہذیبی کا پتہ لگتا ہے۔

شہر کے بعد ملک کی باری آتی ہے اپنے ملک سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے۔ بشرطیکہ یہ ملک دارالسلام ہو اور وہاں مسلمانوں کی تخریب و تباہی کے منصوبے کارفرما نہ ہوں۔ جو مسلمان اپنے ملک سے محبت نہیں کرتا وہ خود اسلام کے دفاع کی طرف سے بے پروائی برتتا اور اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ ملکی ترقی کی بنیاد شہریت کے حقوق کا کماحقہ خیال رکھنے اور اچھا شہری بننے پر منحصر ہے۔ ملک افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر افراد اچھے ہوں گے اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے تن من دھن سے ایثار کریں گے تو ملک خوشحال اور طاقتور ہو جائے گا۔ اور دشمنوں سے محفوظ رہے گا۔ اگر ملک تباہ ہوگا تو افراد بھی تباہی سے نہ بچ سکیں گے خواہ وہ غریب ہوں یا امیر۔ اس لئے ملکی ترقی کے ہر منصوبے میں پوری دلچسپی لو اور عملی کام کر کے دکھاؤ۔ خواہ یہ منصوبہ اقتصادی ہو یا تعلیمی، معاشرتی ہو یا معیشتی، صنعتی ہو یا دفاعی۔ جس ملک کے افراد ملکی ترقی کے منصوبوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ اپنے دشمنوں کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ ہمارے ملک کو تباہ کر دو۔

اسلام تنگ دلی ہرگز نہیں سکھاتا بلکہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر انسان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کہیں بھی نہیں دیا کہ غیر مسلموں سے نفرت کر دیا بلاوجہ ان کے ساتھ سختی اور تشدد سے پیش آؤ۔ چنانچہ سورۃ قصص میں فرمایا ہے کہ،، ہر ایک کے ساتھ ایسی ہی بھلائی کر جیسی اللہ نے تیرے ساتھ کی ہے،،۔ یہ حکم تمام اہل عالم کے ساتھ اچھا سلوک کرنے

کے لئے ہے اسی طرح اور جتنی نیکیوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں بھی کہیں یہ تخصیص نہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی کی جائیں ہاں یہ سچ ہے کہ اللہ نے غیر مسلموں کے ساتھ اس قدر نرمی اور رواداری کی اجازت بھی نہیں دی کہ وہ تمہاری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تم پر چھا جائیں اور رفتہ رفتہ غالب آ جائیں جیسا کہ پچھلی دو صدیوں میں تمام ممالک اسلامیہ کو تجربہ ہو چکا ہے۔ اللہ نے تم کو نہایت سختی سے یہ حکم دیا ہے کہ جو غیر مسلم ممالک تمہیں تباہ کرنے کی فکر اور تدبیریں کر رہے ہوں ان سے ہوشیار رہو۔ ان کے عہد و پیمان اور دوستانہ وعدوں پر بھروسہ نہ کرو۔ ان کے مقابلہ کی تیاریاں کرتے رہو اور جب وہ تم کو تمہارے گھروں یا ملکوں سے بے دخل کرنے کے لئے حملہ کریں تو اتنا لڑو کہ ان کو فنا کر دو یا شہید ہو جاؤ۔ اللہ ہر معاملہ میں صراط المستقیم یعنی اعتدال پر قائم رہنے اور حکمت و عقل مندی سے عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اہل عالم کے ساتھ نیکی، شرافت اور حسن اخلاق سے پیش آنا اسلامی تہذیب و تعلیم کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی جاؤ کلمۃ اللہ اور تہذیب اسلامی کی تبلیغ کرو۔

ظاہر ہے کہ یہ تبلیغ ڈنڈے کے زور اور کمینگی اور بدخوئی کے مظاہرے سے نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو جن لوگوں میں تم تبلیغ کرنا چاہتے ہو وہ تمہارے مذہب کو اور تم کو برا سمجھنے لگیں گے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ جس غیر مسلم یا غیر ملک کے باشندے سے ملو اس کے دل پر اسلامی نیکی، تہذیب اور حسن اخلاق کا سکہ بٹھا دو تا کہ وہ تمہارے مذہب کی خوبیوں کا معترف ہو جائے۔ اب ہم لوگوں سے ملنے جلنے کے آداب و قواعد بیان کرتے ہیں۔

میل ملاقات

اسلام بے حد سوشل مذہب ہے یہ گھروں میں بند پڑے رہنا اور میل ملاقات سے گھبرانا یا کترانا نہیں سکھاتا۔ اسلام میں عبادات تک کی نہج ایسی ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آپس میں ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اس سے موانست و اخوت کے جذبات پرورش پاتے اور وہ روح اجتماعیت پروان چڑھتی ہے جو قومی بقاء کے لئے پہلی ضروری چیز ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو چاہیے کہ میل ملاقات کے مندرجہ ذیل آداب و قواعد پر سختی سے عمل کرے۔

جب تم کسی کے گھر جاؤ تو مناسب یہ ہے کہ پہلے سے ملاقات کا وقت مقرر کر لو تا کہ وہ اس وقت گھر پر موجود رہے۔ جب کسی کے گھر پہنچو تو دروازہ کھٹکھٹاؤ یا نرمی سے آواز دو۔ اگر گھر میں داخل ہونے کی اجازت ملے تو جاؤ لیکن اگر یہ کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس چلے آؤ۔ آج کل

ہزار مسلمانوں میں سے شاید ایک دو ہی ایسے ہونگے جو اس بات کا برا نہ مانیں حالانکہ یہ اللہ کا حکم ہے (دیکھو سورۃ نور رکوع ۴) درحقیقت کوئی آدمی بھی اس قدر بد خلق نہیں ہوتا کہ تم اس کے گھر جاؤ اور وہ ملنے سے انکار کر دے لیکن اگر کبھی کوئی شخص اس طرح انکار کر دے تو تم کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ بلکہ یوں سمجھ لینا چاہیے کہ یقیناً اس وقت اس کے گھر کے حالات ہی ایسے ہونگے جو وہ ملنے سے معذور ہے تم کو کیا معلوم کہ اس وقت وہ کن پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ ایسے وقت میں ملاقات ہو بھی تو نہایت بے لطف ہوتی ہے اس لئے یہ بالکل درست ہے کہ صاحب خانہ صاف صاف معذرت کر دے۔ اور میزبان برا نہ مانے۔

اگر اجازت مل جائے اور تم گھر میں داخل ہو تو پہلے سلام اور مصافحہ کرو پھر مناسب جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب خانہ جو تواضع کرے اس کو قبول کرو۔ بعض لوگ ملنے تو چلے جاتے ہیں مگر جب کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کی جائے تو سختی سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے اس میں غرور و تکبر کی بو آتی ہے اور صاحبہ خانہ کی دل شکنی ہوتی ہے۔ ہاں کوئی بیماری یا پیٹ میں کچھ خرابی ہو تو اور بات ہے۔ ایسی حالت میں میزبان کو بھی ہرگز اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک بیٹھو ایسی گفتگو اور اس قسم کی باتیں کرو جن سے تمہارا بھی دل خوش ہو اور میزبان کا بھی۔ ایسی باتیں کبھی نہ کرو جن سے شکر رنجی اور آزردگی پیدا ہو۔ جب چلنے کا ارادہ ہو تو رخصت چاہو۔ اگر میزبان اور بیٹھنے پر اصرار کرے اور تمہیں فرصت ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو ورنہ وجہ بتا کر معذرت کرو اور سلام کر کے رخصت ہو۔ اگر تم کسی سنجیدہ معاملے کی غرض سے آئے ہو تب بھی تمہاری گفتگو شریفانہ اور خوشگوار ہونی چاہیے۔ جس سے دلوں پر میل نہ آئے۔ اور جدا ہوتے وقت تم بھی خوش ہو اور میزبان بھی کسی کے گھر اتنی زیادہ دیر ہرگز نہ بیٹھو کہ وہ اکتا جائے۔ خیال رکھو کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہے تمہارے زیادہ بیٹھنے سے اس کا کوئی حرج تو نہیں ہو رہا۔

جب کوئی تمہارے گھر آئے تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرو۔ سلام کا جواب دے کر مصافحہ کرو۔ اب اگر سوئے اتفاق سے گھریلو حالات ملاقات کی اجازت نہیں دیتے تو بہ الفاظ شائستہ مہمان سے معافی مانگو اور کہو کہ مجھے وقت دیجئے تاکہ میں خود آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر اس تکلیف فرمائی کی تلافی کروں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر تم ملاقات کے لئے تیار ہو تو مہمان کو اندر بلاؤ اور اچھی جگہ پر بٹھاؤ اور اکل و شرب سے حسب توفیق اس کی تواضع کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص کھانے پینے سے انکار کر دے تو زیادہ اصرار نہ کرو۔ مہمان جب تک بیٹھے اس کے پاس

موجود رہو، کہیں جانا ہو تو معافی مانگ کر اور اجازت لے کر جاؤ۔ انتہائی شگفتہ مزاجی اور محبت بھرے انداز سے پیش آؤ جب مہمان رخصت ہو تو کچھ دور تک اس کو چھوڑنے جاؤ۔

بعض آنے والے ہدیہ لے کر آتے ہیں ان کو شکریہ کے ساتھ بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ ہدیہ دینا اور قبول کرنا سرکار دو عالم کی سنت ہے۔ اس سے تعلقات گہرے اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی آئے تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن جب بہت سے آدمی بیٹھے ہوں تو کسی آنے والے کی تعظیم کے لئے ضروری نہیں کہ سب کھڑے ہو جائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تھے تو تعظیم کے لئے لوگوں کے کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آج امراء، افسران اور حکام کی تعظیم کے لئے اگر کوئی کھڑا نہ ہو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور دل میں کینہ رکھ لیتے ہیں۔ ان کو ذرا خیال کرنا چاہیے کہ نعوذ باللہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت والے تو نہیں ہیں۔

اب ہم میل ملاقات کے بارے میں چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

لباس

جب دو آدمی ملتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو ایک دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے لباس ہے۔ اس لئے جب کبھی گھر سے باہر جاؤ یا کسی سے ملو تو لباس ستھرا، اجلا اور تراش خراش میں مروجہ فیشن کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن باوجود اس کے اگر کسی کا لباس اچھا نہ ہو تو اس پر نکتہ چینی کرنا یا مذاق اڑانا شرافت کے خلاف ہے۔

گفتگو

لباس کے بعد دوسری چیز گفتگو ہے۔ جس سے ایک آدمی دوسرے کے متعلق رائے قائم کرتا ہے یہ گفتگو ہی ہے جو انسان کو دوسروں کی نظر میں مقبول یا مردود بناتی ہے۔ گفتگو ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی شریف ہے یا رذیل، بیوقوف ہے یا عقل مند، مہذب ہے یا بدتمیز، معمولی تعلیم یافتہ ہے یا ان پڑھ، عالم ہے یا جاہل۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تم کو عزت کی نظر سے دیکھیں تو گفتگو میں بہت احتیاط سے کام لو۔ گفتگو کرتے وقت نہ آواز اس قدر بلند ہو کہ سننے والوں پر گراں گزرے، اور یہ معلوم ہو کہ لڑ رہے ہو یا وعظ کر رہے ہو، نہ اس قدر دھیمی ہو کہ سننا اور سمجھنا بھی مشکل ہو جائے۔ لہجہ ہمیشہ نرم اور شیریں ہونا چاہیے۔ بہت زیادہ بولنا یا کسی مجلس میں برابر بولتے رہنا بہت معیوب اور جہالت کی نشانی ہے لیکن بالکل خاموش بیٹھے رہنا بھی اچھا نہیں۔ جب

ضرورت ہو یا کوئی سوال کیا جائے تو ضرور بولو۔ لیکن جو بات کہو معقول اور ضرورت کے مطابق، فضول باتیں کرنے کو بکواس کہتے ہیں۔ بہت جلدی جلدی بولنا معیوب ہے لیکن اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بھی نہ بولو کہ لوگ منہ تکتے رہیں۔ ایسی باتیں ہرگز نہ کہو جس سے سننے والوں کو دکھ ہو یا ان کی تذلیل ہوتی ہو۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بری چیز نہیں لیکن یہ کبھی کبھی ہو تو اچھی ہوتی ہے۔ ہر وقت مذاق اور دل لگی چھچھورے لوگوں کا کام ہے، پھکڑ پن تو کسی وقت بھی جائز نہیں لوگوں کا مذاق اڑانا یا ان کے نام رکھنا، طعنے مہنے دینا اور آواز کسنا شرافت کے خلاف ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے بھی منع کیا ہے زیادہ سنجیدگی بھی اچھی نہیں۔ باتیں کرتے وقت کبھی کبھی مسکرانا یا ہنسنا ضرور چاہیے، چہرے پر خشونت اور رعونت ہرگز نہیں ہونی چاہیے یہ فرعونیت کی نشانی ہے۔ اکثر امراء، حکام اور افسر جب اپنے ماتحتوں یا اہل معاملہ سے بات کرتے ہیں تو چہرہ اس قدر بھیانک ہوتا ہے کہ ڈر لگتا ہے۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ مخاطب اس وقت تو مرعوب ہو جاتا ہے لیکن پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتا اور برائی سے یاد کرتا ہے۔ اگر اظہار ناراضگی ہی ہو تو سنجیدہ لہجہ ہی کافی ہو سکتا ہے۔ جو افسر یا امراء اپنے ماتحتوں سے گندہ ذہنی کے ساتھ پیش آتے ہیں وہ اپنی خاندانی اور ذاتی فرومائگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

گفتگو کسی قسم کی ہو سکتی ہے۔ تفریحی، علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ وغیرہ۔ مگر ہمیشہ موقعہ محل دیکھ کر کرنی چاہیے۔ یعنی جیسا مخاطب یا جس قسم کی سامعین ہوں ان کے سامنے ویسی ہی گفتگو کی جائے۔ دور از کار اور فضول قسم کی بات چیت سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ لوگوں سے ان کے نجی معاملات کے متعلق ہرگز سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔ مثلاً ملتے ہی کسی سے اس کی آمدنی، پیشے یا گھریلو معاملات کی بابت پوچھنا بہت معیوب بات ہے۔ ایسے سوالات بھی ہرگز نہ کرو کہ اگر ان کا صحیح جواب دیا جائے تو تم کو برا لگے۔ ایسی باتوں سے مجلس میں بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے اور کبھی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔ ذرا ذرا سی بات پر اعتراض اور بحث کرنا، دوسروں کی بات کاٹنا یا جب کوئی بول رہا ہو تو بیچ میں بول پڑنا [illegible] ہی بری اور جہالت کی بات ہے۔ عورتوں میں یہ عادت خاص طور پر پائی جاتی ہے۔

ہمیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شادی کے موقعہ پر بہت سی خواتین جمع ہوئیں۔ دو سہیلیاں جو بہت عرصہ سے نہیں ملی تھیں۔ اس قدر چہک کر ملیں کہ سگی بہنیں بھی کیا ملیں گی۔ کئی گھنٹے تک نہایت ہی پیار و محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد وہ ایک ہی پلنگ پر لیٹ گئیں

اور پھر باتیں شروع ہوئیں باتیں کرتے کرتے ایک نے کہا بہن بہت ہی دن بعد ملے۔ میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کو دوسری بولی ہاں بہن دو برس ہو گئے نعیمہ کی شادی میں ملے تھے، ہاں پورے دو برس ہو گئے۔ اس موقعہ پر تو اور بھی کئی لڑکیاں تھیں اب کے ان میں کوئی نظر نہیں آتی۔ اے ہاں، وہ کیسی اچھی لڑکی تھی جو ہمارے ساتھ سوئی تھی، ہاں ہاں بہت ہی خوبصورت تھی بھلا سا نام تھا، مجھے یاد ہے نجمہ نام تھا ہاں ہاں نجمہ۔ دھانی جوڑے میں کیسی پیاری لگتی تھی، دھانی؟ دھانی نہیں سرخ جوڑا پہنے ہوئے تھی، کوئی بھی نہیں دھانی جوڑا تھا، اے واہ تمہیں یاد نہیں رہا۔ اے لو میں تو ایک دفعہ دیکھ لوں پھر بھولتی ہی نہیں۔ تم! تم تو ہمیشہ کی بھلکڑ ہو۔ اور تم! تمہارا تو دماغ ہی خراب ہے۔ اس کے بعد جوان دونوں میں لڑائی اور تو تو میں میں ہوئی ہے تو سارا گھر تماشا دیکھتا تھا۔ صرف جوت پیزار باقی رہ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دو دن تک مہمان رہیں مگر آپس میں بات تک نہیں کی۔ یہ حال ہے خواتین کی جہالت کا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس طرح لڑتی ہیں کہ جائیداد کے بٹوارے پر بھی کوئی کیا لڑے گا۔ پھر عورتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ مرد ہی کون سے بھلے ہیں۔ کوئی مجلس ہو یا محفل گھر ہو یا ہوٹل، ریل میں ہم سفر ہوں یا بس میں ایک آدمی کے منہ سے بات نکلتے بھی نہیں پاتی۔ کہ دوسرا اس پر اعتراض جڑ دیتا ہے۔ اس طرح ہر شخص اپنی لیاقت سلمی اور طاقت لسانی کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ اول درجہ کی جہالت کا ثبوت ہے ایسی ہی فضول اور دور از کار باتوں پر بعض اوقات مہلک لڑائیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد شاہ ایران کراچی تشریف لائے تھے جب وہ واپس چلے گئے تو ایک دن ایک ریسٹوران میں دو آدمیوں میں اس طرح بحث ہوگئی کہ ایک کہتا تھا کہ جب ان کا جلوس نکلا تھا تو وہ تاج پہنے ہوئے تھے۔ دوسرا مصر تھا کہ ٹوپی پہن رکھی تھی یہ معمولی سی بات اتنی بڑھی کہ ایک نے دوسرے کو چاقو مار دیا اور وہ مر گیا۔ مارنے والے کو ایک سال بعد پھانسی ہوئی۔ اب فرمایئے اس سے زیادہ جہالت بھی آپ نے کبھی دیکھی ہے۔

وجود باری تعالیٰ

محمد صدیق ڈار

محفل میلادالنبی ﷺ میں قبلہ حضرت صدیق ڈار صاحب کی گفتگو جو ریکارڈ کرلی گئی تھی اسے قارئین "فلاح آدمیت" کے استفادہ کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ (گذشتہ سے پیوستہ)

1- وجود باری تعالیٰ

سوال :- قبلہ جس طرح ہم مسلمان کہتے ہیں کہ نماز میں بڑا سکون ملتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب والے بھی دعوے کرتے ہیں کہ ہماری عبادات میں بھی ذہنی اور روحانی شانتی کا انتظام ہے۔ ان مذاہب کے کئی سکالر قرآن کریم کو آسمانی کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ یورپ کے اکثر لوگ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کے بھی منکر ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم اسلام کی صداقت کے کس طرح قائل کرسکتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ تو معقول دلائل ہیں۔ اپنے علماء سے اگر ہم کفار کے پیش کردہ شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہیں تو وہ ڈانٹ دیتے ہیں۔ کہ ان باتوں کی طرف نہ جاؤ بے دین اور کافر ہو جاؤ گے۔ وہ ڈراتے ہیں کہ اس طرح تم دہریہ ہو جاؤ گے۔ ہمارے کئی دوست یعنی مسلمان بھائی علماء کے رویے کی وجہ سے بددل ہوگئے ہیں کہ وہ سائل کو مطمئن نہیں کرسکتے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے ہمارے پاس عقلی اور منطقی دلائل کا ذخیرہ موجود ہوتا کہ مخالفین کو قائل کیا جاسکے.........

شیخ سلسلہ :- ہر دور میں اچھے علماء مخاطب کے ذہنی معیار کے مطابق عقلی دلائل بھی دیتے رہے ہیں۔ اگر بات اس کے دل کو لگ گئی تو اس کا کام تو ہوگیا۔ صدیوں پہلے اونٹ کی مینگنیوں والی دلیل بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ حضرت علیؓ نے بدو سے فرمایا کہ یہ اونٹ کی مینگنیاں دیکھ رہے ہو۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اونٹ کا وجود ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت ہمیں کہیں نظر نہیں آرہا۔ تو بدو نے یہ بات تسلیم کرلی۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اسی طرح یہ زمین، چاند، سورج، ستارے جو نظر آرہے ہیں تو ان کا بنانے والا بھی ضرور موجود ہے چاہے وہ نظر نہ آئے تو اس دلیل سے بدو نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرلیا۔

سوال :- ہوسکتا ہے وہ مینگنیاں اونٹ کی نہ ہوں کسی اور جانور کی ہوں۔

شیخ سلسلہ :- وہ بدو مینگنیوں کا ماہر تھا۔ دلیل اس کے علم کے مطابق دی گئی تھی اس لئے اسے ماننا ہی پڑا۔ پچھلے دنوں ہمارے مولوی صاحب اسی طرح کا قصہ بیان کر رہے تھے کہ ایک دہریہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے مصر تھا کہ اگر اللہ موجود ہے تو مجھے دکھاؤ۔ حضرت صاحب نے ایک بڑے برتن میں دودھ منگوایا اور اس دہریہ سے پوچھا کہ تم بتاؤ کہ اس میں مکھن موجود ہے؟ تو دہریہ نے سوچا کہ اگر کہوں کہ نہیں ہے تو امام صاحب مدھانی چلا کر مکھن نکال کر دکھا دیں گے۔ اس نے مجبوراً کہا کہ موجود ہے۔ تو امام صاحب نے فرمایا کہ موجود ہے تو تم ہی دکھاؤ کہ کہاں ہے۔ مطلب یہ ہے موقع و محل کی مناسبت سے **If it works** اگر دلیل کارگر ہو جائے تو ٹھیک ہے۔

یہ یورپ کے عام لوگ جو دہریت کی گرفت میں آگئے ہیں معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ان کے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں یا سائنسدان ہیں۔ مثلاً آئن سٹائن تھا۔ اور وہ ایک مشہور کتاب ہے **A Brief History of Time** اس کے مصنف کا کیا نام ہے۔ ہاں اس کا نام ہے سٹیفن ہاکنگز۔ جو کہ اس وقت برطانیہ کا سب سے بڑا سائنسدان ہے۔ اس نے بھی لکھا ہے اور آئن سٹائن جسے بیسویں صدی کا عظیم انسان مانا گیا ہے اس کا بھی کہنا تھا کہ اگر یہ کائنات ازلی ہے اور ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آرہی ہے تو پھر خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ خدا کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ کائنات کسی وقت وجود میں آئی ہے۔ فلسفہ کی زبان میں اسے حادث کہتے ہیں۔ ایک ہوتی ہے قدیم ایک ہوتی ہے حادث۔ قدیم وہ ہوتی ہے جو ازل سے ہی چلی آرہی ہو اور حادث وہ ہوتی ہے جو کسی وقت **Creat** ہوئی پہلے نہیں تھی پھر پیدا کی گئی۔ ان کا کہنا تھا اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کائنات حادث ہے تو پھر اسکے پیدا کرنے والے کو بھی ماننا پڑے گا۔ یہ موقف دہریہ سائنسدانوں کا تھا۔ اب تو پوری دنیا اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے کہ کائنات حادث ہے۔ **Big Bang** یعنی عظیم دھماکہ کی تھیوری یہ کہتی ہے کہ اب سے تقریباً بارہ سے اٹھارہ بلین سال پہلے ایک عظیم دھماکہ ہوا۔ حرارت اور روشنی نے کئی مرحلے طے

کئے۔ پھر لاکھوں برس بعد ایٹم بنا پھر مادے سے کہکشائیں اور کئی نظام شمسی بنے۔ اب ان کا پہلا سٹینڈ کہ خدا کا وجود نہیں ہے اور کائنات ازلی ہے ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں بچپن میں پڑھایا گیا تھا کہ مادہ نہ پیدا کیا جا سکتا ہے نہ فنا ہو سکتا ہے۔ اب دہریت کی اصل بنیاد کہ مادہ قدیم ہے منہدم ہو گئی ہے۔ اب سائنسدان تسلیم کر چکے ہیں کہ اتنے بلین برس پہلے تخلیق کائنات کی ابتدا ہوئی۔ وہ خود ہی یہ اصول بتاتے تھے کہ اگر یہ ثابت ہو جاء کہ کائنات Creat یعنی تخلیق ہوئی ہے تو پھر خالق کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اب ان دہریوں کے باپ تو خالق کو مان گئے ہیں لیکن یہ بچے شرارتیں کر رہے ہیں کہ اللہ کے ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ ثبوت یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے دے دیا کہ ان کے حد علم میں یہ بات آ گئی کہ کائنات حادث ہے۔

سوال :- یہ اصول تو آئن سٹائن نے بتایا تھا۔ عام لوگوں نے تو نہیں بتایا تھا۔

شیخ سلسلہ :- وہ آئن سٹائن انہیں کا ہے ہمارا تو نہیں۔ وہ خود ہی اس کو صدی کا دانشور اور عظیم انسان قرار دے چکے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ اگر کائنات حادث ہے تو اس کا خالق بھی موجود ہے۔ اگر میگنیوں والی دلیل نہیں مانتے تو ایک عظیم سائنسدان کی منطقی دلیل کو تو مانئے۔ جو بھی چیز وجود میں آتی ہے اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی Reason یا علت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا سٹینڈ بالکل سائنٹیفک اور معقول تھا۔

ایک امریکن کتاب ہے جو ساٹھ کی دہائی میں چھپی تھی۔ اس کا نام ہے "The Existance of God in the Expanding Universe" پاکستان میں اس کا اردو ترجمہ ملتا ہے جس کا عنوان ہے "خدا موجود ہے"۔ مولانا مودودیؒ صاحب نے اس کا دیباچہ لکھا ہوا ہے۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز اور مکتبہ فرینکلن کی مشترکہ اشاعت تھی۔ اس میں چالیس سائنسدان جو کہ علیحدہ علیحدہ شعبوں کے ماہر تھے کی Statements ہیں کہ تحقیق کے کون کون سے مقامات پر پہنچ کر ہم مجبور ہو گئے کہ ایک ذی شعور، مدبر و منظم ہستی کا اقرار کرنا پڑا۔ تحقیق کے دوران جب جامد اور بے شعور مادے کے اندر حیرت انگیز نظام اور سسٹم کام کرتے ہوئے نظر آئیں تو ایک نہایت ہی ذہین مہندس اور کاریگر ہستی کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔ جس نے

یہ سب کچھ ترتیب دے رکھا ہے۔ اگر کسی سڑک کے کنارے گندم کے دانے بغیر کسی ترتیب کے بکھرے ہوئے ہوں تو کہہ سکتے ہیں کہ کسی بوری سے اتفاقاً گر گئے ہونگے۔ لیکن اگر وہی دانے خاص ترتیب اور ڈیزائن کے ساتھ پڑے ہوئے ہوں مثلاً ایک دائرہ ہے پھر تکون ہے پھر دائرہ ہے پھر تکون بنی ہوئی ہے اور اسی طرح ڈیزائن بنتا چلا گیا ہے تو پھر ہم اسے اتفاق نہیں گردان سکتے بلکہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی ذہین اور باشعور ہستی نے دانوں کو اس خاص ترکیب سے جوڑا ہوا ہے۔ یہ ساری کتاب ایسے ہی حیرت انگیز بیانات کا مجموعہ ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے بھی باعث تقویت ایمان ہے اور دہریوں کے بچونگڑوں کے لئے بھی درس عبرت ہے۔ یہ بڑی اچھی کتاب ہے۔ ایک دوسری کتاب بھی تھی جس کا ٹائٹل تھا "خدا ہمارے ساتھ ہے" وہ تو نہیں مل سکی لیکن "خدا موجود ہے" عام دستیاب ہے۔ اسی کتاب میں ایک سائنسدان نے بڑی اچھی اور معقول بات لکھی کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ کائنات کا خالق موجود ہے تو وہ نہ صرف ہمارا خالق قرار پائے گا بلکہ ہمارا مالک بھی وہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو ہستی کسی شے کو عدم سے وجود میں لاتی ہے تو وہی اس کی مالک بھی قرار پائے گی۔ تو پھر ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ جو معاملات ہمارے اور مالک کے درمیان ہیں اور جو ہمارے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ ہیں ان میں مالک کی رضا معلوم کریں کہ وہ کن اعمال پر خوش ہوتا ہے۔ یعنی اب اس نے شریعت کی اہمیت بھی تسلیم کر لی۔ شریعت یہی بتاتی ہے فلاں فلاں اعمال بجالاؤ کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور فلاں فلاں کاموں سے اجتناب کرو ورنہ اللہ ناراض ہوگا۔ تو یہ ہے حقیقت کہ سلیم الطبع دانشور اور سائنسدان تو ہدایت پا جاتے ہیں لیکن عوام الناس جو دہریت کی مسموم فضا اور مذہب گریز فیشن کے زیر اثر ہوتے ہیں ان میں حق کی جستجو ہی باقی نہیں ہوتی اس لئے وہ نعمت ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔

بہر حال ان لوگوں سے ان کے علمی معیار اور سائنسی مسلمات کے مطابق بات کرنا ہی حکمت کا تقاضہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک روحانی طریقہ بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی روح کا فیض عطا فرمایا اور تمام فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام انسانی ارواح کو نکالا اور انہیں ہمکلامی کا شرف عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو تمام ارواح نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان اور اسکی ربوبیت کے اقرار کا بیج روز ازل ہی ہر روح کے اندر ڈال دیا گیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہر انسان کے لاشعور میں پوشیدہ ہے۔ اب یہ طریقہ بھی مفید اور اہم ہے کہ کوئی مقدس ہستی اپنے روحانی فیض یا قلبی توجہ سے اس پوشیدہ حقیقت کو بیدار کر دے یعنی انسان کے دل کے اندر جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا بیج سویا ہوا ہے وہ پھوٹ پڑے اور بڑھتا جائے اور اس پر وہ پھول آئیں کہ روح اللہ کی محبت کی مہک سے مسرور ہو جائے۔ یہ روحانی بزرگوں کا طریقہ ہے اور یہ انسان پر آزمایا جا سکتا ہے اور نہایت ہی موثر ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور اس کی قدرت کے نشانات بیان کر کے زبانی دعوت کا مقصود بھی انسان کے ضمیر پر دستک دیتا ہے کہ اسے عہد الست یاد آ جائے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ الحدید میں آتا ہے۔ **ما لکم لا تومنون باللہ ورسول یدعوکم لتومنوا بربکم۔ واخذ میثاقکم ان کنتم مومنین o** "اے لوگو تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہو۔ اور رسول تمہیں یہ دعوت دے رہا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ۔ اس نے تم سے اس بات کا عہد بھی لے رکھا ہے اگر تم یقین جانو" گویا دین اسلام کی دعوت جو ہے وہ روز ازل کئے گئے عہد ربوبیت کی تجدید ہے۔ اس عہد کے مطابق اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرنا اسلام میں داخل ہو جانا ہے اور اپنے رب یعنی آقا و مالک کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنا صراط مستقیم اور فلاح دارین کی راہ ہے۔ یہ روحانی توجہ کا طریقہ ایسا ہی ہے جیسے کسی طاقتور مقناطیس کی لہروں کے ذریعے کسی دوسرے عام لوہے کے ٹکڑے کو بھی مقناطیس بنا دیا جائے۔

دیکھیں جی اس بیرونی دنیا کے علاوہ انسان کے اندر کی دنیا بھی ایک حیرت کدہ سے کم نہیں۔ انسانی جسم کا ایک ایک عضو قدرت کا طلسم خانہ ہے۔ انسان کا دماغ اتنا پیچیدہ اور نازک ہے کہ ہمارا بڑے سے بڑا کمپیوٹر اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر دل، جگر، ہضم، سماعت اور بصارت کے حیرت انگیز نظام کس نے بنائے۔ اگر جینز تھیوری پر جائیں تو جینز کو اتنی

سمجھ بوجھ اور طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل کرنے کی صلاحیت کس نے عطا کی۔ مرغی کے انڈے کے اندر دو رنگ کا لیس دار مادہ ہوتا ہے اور آپ کے سامنے اس کے اندر سے تمام تر تفاصیل کے ساتھ ایک زندہ چوزہ برآمد ہوتا ہے کیا یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کا معجزہ نہیں ہے۔ کیا یہ کارنامہ مرغی کا ہے یا اس لیس دار مادہ کے ذہن کا کرشمہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان بے شعور اسباب سے بالاتر ایک ہستی کا وجود لازمی ہے جس کے حکم اور ارادے کے مطابق جینز سمیت کائنات کا ذرہ ذرہ عمل پیرا ہے۔ آپ تو اشرف المخلوقات ہونے کے دعویدار ہیں پھر بھی آپ چوزے کے جسمانی اعضاء کے سرکٹ کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں نہ ہی بنا سکتے ہیں۔ بس وہ اللہ کی ذات ہے جس نے جینز کو پروگرام کیا ہے اور انہیں اللہ کی طرف سے دی ہوئی ڈیوٹی کا پورا احساس ہے۔ ہر جین جانتا ہے کہ اسے جسم کے کونسے عضو کا حصہ بننا ہے اور وہ اپنی طے شدہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ دل، جگر، پھیپھڑوں اور ہڈیوں کو بنانے والے جین ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن **حیی قیوم** آقا کے فرمان کے مطابق ہر شے مصروف عمل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو بیج کے اندر پورے درخت کا سائز، پتوں کی ساخت، پھولوں کا رنگ اور پھل کی صورت اور ذائقہ بھی کچھ بند کر دیتی ہے۔ پھر اسی کے حکم سے اس کے پیدا کردہ اسباب کے ذریعے وہ پھوٹتا ہے اور بڑھتا ہے لیکن خالق کائنات نے جو حدود اس کے لئے مقرر کر رکھی ہیں ان سے تجاوز نہیں کرتا۔ کوئی پودا بالشت بھر لمبا ہے کوئی گز بھر ہے اور پھر تناور درخت ہیں **ذالك تقدير العزيز العليم** o کیا قدرت کے یہ کرشمے اور انسان کا اپنا وجود اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا شافی و کافی ثبوت نہیں ہے۔ اسی لئے کج فہم لوگوں کے لئے علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا:۔

تیری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا

تم کہتے ہو کہ خدا نہیں میں کہتا ہوں کہ تو نہیں ہے۔ اگر تو ہوتا تو اپنے خالق سے انکار نہ کرتا۔ تم اپنے آپ کو ہی سمجھ نہیں پائے۔ تمہیں علم ہی نہیں کہ تمہارے اندر کتنے پیچیدہ نظام کارفرما ہیں۔

(جاری ہے)

خواجۂ کے خطوط

تدوین: خالد مسعود توحیدی

1- عمر بھر کا لائحہ عمل

(بنام محمد حیات صاحب 5-9-1972)

"خوشی ہوئی کہ پاس انفاس اور نفی اثبات آپ باقاعدہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح کرتے رہو ساری عمر کرنا ہے۔ اسی سے سب کچھ ملتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ دن میں ایک ہزار مرتبہ یہ ورد ضرور پڑھ لیا کرو۔ صل اللہ علیک یا رسول اللہ۔ دوسری بات یہ کہ غصہ اور نفرت کی مکمل نفی اور عالمگیر محبت اور حق پر عمل بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر روحانی طاقت بھی پیدا ہو جائے تو بیکار ہے۔ تیسری بات کہ حلقہ کے بھائیوں سے ایسی سچی محبت کرو جو سگے بھائی بھی آپس میں نہیں کرتے۔ ان باتوں پر عمل کرنے سے انشاءاللہ دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو گے۔"

2- اہلیہ کی اصلاح

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 4-12-1959)

"آپ کی اہلیہ آپکے ساتھ رہتی ہے یا گاؤں میں اگر گاؤں میں رہتی ہے تو اسے ہمیشہ ساتھ رکھیں تب ہی اسکو نماز کی عادت پڑ سکتی ہے اور وہ آپ کے حسب خواہ سانچے میں ڈھل سکتی ہے گاؤں میں تو وہ جیسی ہے ویسی ہی رہی گی۔ آپ کے صحبت میں راستہ بدل جائے گی ممکن ہے اللہ والی بن جائے حق یہی ہے کہ وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی اور آپ اس کے بغیر نہ رہ سکتے ہیں نہ آرام پا سکتے ہیں۔ تمام مصیبتوں کا علاج یہی ہے کہ بیوی کو ہمیشہ ساتھ رکھا جائے۔"

3- رسالپور میں باباجی کے دوست

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 21-2-1966)

"یہ خط دستی بھیج رہا ہوں یہ میرے بہت پرانے دوست عزیز احمد خاں صاحب ہیں رسالپور ہی میں رہتے ہیں ان سے ملتے رہا کرو2۔ وہاں رسالپور میں فلائٹ لیفٹینینٹ یونس صاحب کے والد حاجی ظریف حسین صاحب ہیں وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ان کا خط آیا تھا کچھ اللہ اللہ کرنا چاہتے ہیں میں نے لکھ دیا ہے کہ آپ سی مل لیں

4- ساتھ غنیمت جانو

(بنام جمیل اختر صاحب 21-2-1972)

"تعجب ہے صدیق ڈار کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپ نفی کی بابت مجھے لکھتے ہیں جو شکایت ہے ان سے کہا کرو۔ان کا ساتھ غنیمت جانو اور فیض بھی اور جو سمجھ میں نہ آتا ہو سیکھ بھی لو۔

5- بڑے بڑے لوگ

(بنام محمد صدیق ڈار صاحب 21-2-1968)

"اب تو حلقہ کے بڑے بڑے لوگ سرگودھا آ گئے ہیں۔حلقہ کو مضبوط کرنا اللہ اللہ کرانا اور اخلاق کی تعلیم دینا بہت آسان ہو جائے گا۔

6- جسطرح بتایا جائے کرتے رہیں

(بنامحمد قاسم صاحب 21-2-1960)

"غیور احمد صاحب یا محمد علی سے ملیں وہ آپ کو پاس انفاس اور نفی اثبات کا ذکر بتا دیں گے حلقہ میں باقاعدہ شامل ہوتے رہیں اور جسطرح بتایا جائے کرتے رہیں۔رفتہ رفتہ سب کچھ میسر ہو جائے گا

7- جرمانہ کبھی کبھی ہونا چاہیے

(بنام محمد قاسم 21-2-1961)

"خط پڑھ کر بہت مزا آیا رمضان شریف کے حلقہ اور افطار کا معاملہ بھی خوب ہے اور سب سے زیادہ مزے کی بات تو جرمانہ ہے یہ کبھی کبھی ہونا چاہیے زیادہ ہونے لگے گا تو اثر جاتا رہے گا۔

8- حلقہ ذکر کی اہمیت

(بنام محمد قاسم 21-2-1965)

"حلقہ ذکر میں ضرور شامل ہوا کریں آپ حلقہ میں شمولیت سے استثنیٰ ہونا چاہتے ہیں تو یہ میں نہیں کر سکتا ورنہ ہر شخص ہی کہے گا۔البتہ کبھی کبھی حاضری نہ ہو سکے تو مضائقہ نہیں حلقہ نہیں تو ویسے ہی احباب حلقہ سے مل بیٹھا کریں۔

کلمہ سواء

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری)

اگر توحید کا انسانی زندگی اور انسانی معاشرے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو توحید محض ایک شاعری یا "ڈاگما" سے زیادہ دقیع شے نہ ہوتی اور نہ اس پر سارے انبیاء اتنا زور دیتے۔ اسلامی تعلیمات اس معاملے میں اتنی واضح ہیں کہ دنیا کا اور کوئی مسئلہ اتنا واضح نہیں۔ وحدت ربانی پر اتنا زور دینے کی وجہ ہی صرف یہ ہے کہ معاشرہ انسانی سے اس کا بڑا گہرا ربط ہے اور ہر قدم پر اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ توحید محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ اصول حیات، جان زندگی اور ضامن امن کائنات ہے جس کا پہلا اثر اور اول قدم ہے وحدت انسانی۔

وحدت انسانی کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک امت اور ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد ہیں۔ **وما کان الناس الا امة واحدة** لہٰذا ان سب کے حقوق یکساں ہیں، کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں۔ سب مساوی ہیں، قانون کے آگے کسی کی کوئی امتیازی حیثیت نہیں۔ کوئی انسان اپنا کوئی پیدائشی حق لے کر نہیں آیا۔ کسی عجمی کو عربی پر یا کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر، کسی وطن کو دوسرے وطن پر، کسی زبان کو دوسری زبان پر، کسی پیشے کو دوسرے پیشے پر، کسی رنگ کو دوسرے رنگ پر کوئی ایسی فضیلت حاصل نہیں جو تقرب الٰہی بخش سکے۔ اگر کسی کو کسی پر کوئی درجہ، تقرب یا فضیلت ہے تو وہ صرف حسن کردار کی وجہ سے ہے۔ **ان اکرمکم عند الله اتقکم**o

جو شخص اس نصب العین پر ایمان نہیں رکھتا اور رنگ، نسل، وطن، زبان، پیشے یا فرقے وغیرہ کو درمیان میں حائل کر کے انسانی وحدت میں تفریق پیدا کرتا ہے۔ وہ اسی طرح مشرک ہے جس طرح وحدت ربانی سے مکرنے والا مشرک ہوتا ہے جب ہی تو قرآن نے کہہ دیا ہے کہ...

ولا تکونوا من المشرکین o من الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعا

"تم ان مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دینی تفریق کر کے گروہ بندیاں پیدا کر لیں"

ابن عربیؒ کا خواب

اس موقعے پر ایک بڑی عبرت آموز حکایت سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ شیخ اکبر محی الدین ابن

عربیؒ کے زمانے میں ایک بڑے متشرع قاضی صاحب تھے جو ابن عربیؒ کے شیخ کو برا بھلا کہتے تھے۔ اپنے شیخ کے بارے میں اس قسم کے الفاظ کا ناگوار ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس لئے ابن عربیؒ کو ان صاحب سے سخت نفرت ہوگئی۔ ایک دن ابن عربی نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آنحضرت ﷺ نے قاضی صاحب کے بارے میں دریافت فرمایا تو ابن عربی نے کہا کہ: یا رسول اللہؐ! مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ وہ میرے شیخ کو برا سمجھتا ہے انہیں برا کہتا ہے میں اسے کیسے برداشت کرسکتا ہوں؟ اگر میں اس سے نفرت کا اظہار نہ کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اس کی قابل نفرت باتوں سے راضی ہوں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ:۔ اچھا یہ بتاؤ وہ قاضی میرے بارے میں کیا کہتا ہے؟ ابن عربی نے کہا کہ: حضورؐ کے بارے میں وہی کچھ کہتا ہے جو ایک سچے مسلمان کو کہنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: تمہیں اپنے شیخ کا تو اتنا لحاظ ہے کہ جو انہیں برا کہتا ہے اسے تم برا سمجھتے ہو لیکن میرا اتنا لحاظ بھی نہیں کرتے کہ جو مجھے اچھا سمجھے اسے تم اچھا سمجھو؟ .... آنکھ کھلنے کے بعد ابن عربی کی چشم بصارت بھی کھل گئی اور قاضی صاحب کے پاس آکر انہوں نے اپنا دل صاف کرلیا۔

اس خواب میں کیا درس ہے

کہنے کو تو یہ ایک خواب ہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اخلاص اور توحید کی ساری کائنات اس میں سمٹی ہوئی ہے اگر ہم کسی سے اختلاف اور نفرت رکھنا چاہیں تو اس کے لئے سینکڑوں منطقی وجوہ تلاش کرسکتے ہیں اور اگر اتحاد و محبت کی وجوہ ڈھونڈنا چاہیں تو وہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں مل سکتی ہیں۔ اول الذکر کا نتیجہ باہمی عداوت، جنگ اور بدامنی ہوگی اور ثانی الذکر کا ثمرہ باہمی محبت، دوستی، امن اور سلامتی کی شکل میں نمودار ہوگا۔ پھر یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم جتنا نیچے اترتے جائیں گے اختلاف کی خلیجوں میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور جس قدر اوپر چڑھتے جائیں گے اسی قدر وحدت کے عوامل میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اختلافات کی خندقیں پٹتی چلی جائیں گی۔

یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص صرف دادا کی اولاد سے دلچسپی رکھتا ہو تو پڑدادا کی اولاد اس کے دائرہ دلچسپی میں نہیں آئے گی۔ اور اگر پردادا کی اولاد سے دلچسپی رکھنے لگے تو اس کا دائرہ وسیع تر ہوجائے گا لیکن پھر بھی اور اوپر کے جد مثلاً سردادا کی اولاد اس دائرے میں نہ آسکے گی۔ غرض جتنا نیچے اتریے اتنا ہی دائرہ تنگ ہوتا جائے گا اور جس قدر اوپر جایئے اسی قدر انسانی برادری میں

وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

وحدت انسانی کی قرآنی دعوت

اسلام نے اس معاملے میں انسانی برادری کی وسعت کے لئے آخری مرکز کو اختیار کیا ہے۔

قرآن کہتا ہے:-

اذا خلقنکم من ذکر و انثیٰ

"ہم نے تمہیں ایک مرد و زن سے پیدا کیا ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

انکم من اٰدم واٰدم من تراب "تمہارا باپ آدم ہے اور وہ مٹی سے بنا ہے"

اس پیغام کو انسانی برادری کا نصب العین ماننے کے بعد اتنی وسعت و ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے کہ رنگ و نسل، وطن و زبان اور پیشہ و مسلک کے سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور "**ما کان الناس الا امة واحدة**" انسان کا نصب العین بن جاتا ہے۔ یہی ہے وہ وحدت جو لازمی نتیجہ ہونا چاہیے وحدت ربانی کے عقیدے کا۔ اور یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ٹکڑے خواہ وحدت زبانی کے کئے جائیں یا انسانی برادری کے یا دین کے یہ سب کے سب شرک ہیں۔ ہر قبیلے کا الگ الگ بت بھی موجب شرک ہے اور ہر قبیلے کی پیدائشی حقوق الگ الگ کر لئے جائیں جب بھی شرک ہے، خدا ایک ہے اگر چہ اس کی صفات بے شمار ہیں۔ دین صرف ایک ہے، اگر چہ رنگ، نسل، زبان، پیشے اور اوطان متعدد ہیں۔ اگر ذرا آگے قدم رکھیے تو آپ کو کائنات میں بھی وحدت ہی نظر آئے گی لیکن اس وقت یہ گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

فلسفہ اور تصوف کا خلاصہ

فلسفے اور تصوف کی ساری تگ و تاز کا مرکز ہے کثرت میں وحدت کی تلاش۔ گویا صحیح فلسفہ اور اعلیٰ تصوف کثرت میں وحدت کو تلاش کرتے ہیں اور شرک وحدت میں کثرت کو ڈھونڈا کرتا ہے۔ وحدت ہی کے مادے سے اتحاد بھی ہے اور اتحاد ہی کی ضد ہے اختلاف و تفریق جناب ابن عربیؒ کے مذکورہ بالا خواب میں اسی حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ اپنے پیر یا شیخ کو درمیان میں لاکر کسی سے اختلاف رکھنے کے بجائے سارے پیروں کے پیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کو دیکھ کر عوامل اتحاد کو تلاش کرنا چاہیے۔

سبب اختلاف

یہ اتنی اعلیٰ قدر ہے کہ کم از کم وحدت امت کے لئے تو اس سے بہتر کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ خوب غور کیجئے تو اختلاف امت کا اصل سبب یہی نظر آئے گا کہ ہم میں سے ہر فرقے نے اپنا اپنا جدا گانہ پیشوا و امام بنا رکھا ہے۔ صرف امام و پیشوا بنا لینے میں تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہر شے کو اسی امام و پیشوا کی نسبت سے دیکھا جانے لگا یعنی ہر چیز کو پرکھنے کی آخری کسوٹی واحد معیار اور تنہا سند وہی امام بن گیا۔ گویا وہ جس بات کو صحیح کہہ دے وہ صحیح، اور جسے وہ غلط بتائے وہ غلط۔ مثلاً فرض کیجئے ایک امام کہتا ہے کہ دفعتہً تین طلاقیں مغلظہ ہوتی ہیں اور دوسرا کہتا ہے کہ رجعی ہوتی ہیں تو دونوں کے پیرا اپنے اپنے موقف پر قائم رہیں گے اور کوئی بھی اپنا تقلیدی مسلک نہ چھوڑے گا کیونکہ جسے اس نے آخری سند تسلیم کیا ہے وہ اس سے ہٹنے پر آمادہ نہیں۔ لہٰذا اتحاد کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

اسلام کی دعوت

اسلام نے تو اس معاملے میں ایسی فراخدلی اور توسع اختیار کیا ہے کہ اس سے بالاتر کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصٰرٰی والصٰبین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر و عمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون٥

"مسلمانوں، یہودیوں نصرانیوں اور صابیوں میں جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور اس کے مطابق عمل کرے ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ان پر نہ کوئی حرف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے"

قرآن کے حکم کے مطابق آنخضرت ﷺ اہل کتاب کو اتحاد کی دعوت یوں دیتے ہیں۔

تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم الانعبدو الا اللہ ولا نشرك به شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ.....

"اور ایک ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں و برابر ہو وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور ہم میں کوئی بھی کسی کو اللہ کے مقابلے میں رب نہ بنائے گا"

اوران سب کا نچوڑ حضور ﷺ نے چند لفظوں میں یوں ادا فرما دیا کہ :

من قال لا اله الا الله دخل الجنة

"جو بھی لا الہ الا اللہ کا قائل ہو وہ جنتی ہوگا"

بس یہی ہے آخری مرکز اتحاد جس سے زیادہ جامع، وسیع اور ہمہ گیر اور کوئی مرکز ممکن نہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہیے کہ مثلاً "حنفیت" پر تمام حنفیہ متحد ہو سکتے ہیں لیکن غیر حنفی اس سے نکل جائیں گے۔ اسی طرح کسی پیغمبر پر صرف اس کی امت اجابت ہی مجتمع ہو سکتی ہے۔ باقی ساری دنیا اس سے باہر ہوگی۔ لیکن وحدت ربانی وہ مرکزی دعوت ہے جس پر سارے بنی آدم اور ساری انسانی برادری اکٹھا ہو سکتی ہے۔

صرف دو گروہ

وحدت انسانی سے پہلے وحدت امت ضروری ہے۔ خاتم النبیینؑ کے پیغام وحدت انسانی کے بعد قدرۃً دو گروہ ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اس تصور کے پیغام کو مانے اور دوسرا جو اس سے انکار کرے۔ اسی حقیقت کو قرآنی اصطلاح میں اسلام اور کفر کہتے ہیں۔ دوسری طرف امت ہی کے اندر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک وحدت امت باقی رہے یا ختم ہو جائے اور اصل دین باقی رہے یا نہ رہے مگر ان کا اپنا فرقہ اور اس کے محدود تصورات ضرور باقی رہیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جسے قرآن نے شرک بتایا ہے۔

اسلامی بنیاد قومیت

سوچئے کہ نسل کو اسلام نے قومیت کی بنیاد کیوں نہیں بنایا؟ یہ کیوں ہوا کہ حقیقی عم رسول صلعم (ابولہب) کو کافر اور جہنم کا ایندھن بتایا گیا اور بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، اور عبداللہ بن سلام کو آغوش فردوس میں جگہ دی گئی؟ اگر نسل کی بنیاد قومیت قرار دیا جاتا تو اس نسل کے سوا باقی تمام نسلوں کے لئے دروازہ بند ہو جاتا اور وحدت انسانی کے لئے کوئی جگہ ہی نہ رہتی۔ اسی طرح رنگ، زبان، پیشے اور وطن کو بھی سمجھ لیجئے ان میں سے کوئی شے بھی ایسی نہیں جو وحدت انسانی تو کجا وحدت امت کا بھی مقصد پورا کر سکے۔ بالکل یہی شکل فرقے بندیوں کی بھی ہے کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں جو وحدت امت کے مقصد کو پورا کر سکے۔

کلمہ سواء

مجھے یہاں وہ بات نہیں بھولتی جو قائد اعظم نے کئی بار کہی تھی۔ ان سے جب بھی کسی نے

دریافت کیا کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا تو انہوں نے ایک جواب دیا کہ "قرآن" وہ اللہ کا
کبھی اس سے نیچے اترا ہی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ انہیں دوسرے علوم اسلامی
انکار تھا۔ فہم قرآن کے لئے احادیث وروایات، فقہی مکاتب فکر، تاریخ، لغت، صرف نحو، معانی
بیان وغیرہ سب ہی ضروری ہیں لیکن ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے نقطہ اتحاد، مرکز دعوت
کلمہ سواء صرف قرآن ہی ہوسکتا ہے۔ دیگر تمام علوم بھی (حسب مراتب) اسلامی علوم ہی میں
داخل ہیں اور سب ہی فہم قرآن میں مددگار ہیں۔ لیکن جس طرح رنگ، زبان، نسل، وطن،
کے اختلافات کے باوجود کلمۃ **لا الٰہ الا اللہ** وحدت انسانی کی بنیاد ہے۔ اسی طرح
روایات، تاریخ، فقہ وغیرہ کے اختلافات کے باوجود وحدت امت کی اساس صرف قرآن ہے
اس سے جس قدر نیچے اترتے جائیں گے اسی قدر تفریق امت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لئے
اگر ہم وحدت امت چاہتے ہیں تو کسی دوسری چیز سے اتنا نہیں چمٹنا چاہیے جو قرآنی وابستگی
حاوی ومسلط ہوجائے۔

اخلاص نیت اور اس کی پرکھ

ابن عربی کے مذکورہ بالا خواب میں ایک بڑی اعلیٰ قدر اخلاص نیت بھی ہے آپ نے دیکھا
کہ جب تک ان کے شیخ ایک مکمل واسطہ بنے رہے انہیں قاضی سے سخت نفرت رہی لیکن جونہی
رسول اللہ ﷺ اصلی واسطہ بنے یہ اختلاف دور ہوگیا۔ پہلے بھی اخلاص تھا لیکن صرف شیخ تک
محدود تھا جب اس اخلاص میں بلندی ووسعت پیدا ہوئی تو اوپر شیخ الشیوخ ﷺ کے تصور نے
اخلاص کی محدودیت کو ختم کردیا جواب تک صرف شیخ سے وابستہ تھا۔ کسی شخصیت یا فرقے
وابستگی اخلاص کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے۔ اس اخلاص کا رخ صحیح سمت میں نہ بھی ہو تو وہ اخلاص
مستحق اجر ہوگا۔ خاطی مجتہد کی طرح وہ ایک اجر کا تو حقدار ہوگا ہی لیکن آیا وہ واقعی مخلص ہے
نہیں؟ اس کی پرکھ صرف اس وقت ہوگی جب آخری سند اور آخری حجت اس کے سامنے آجائے
اور حق بات کا علم ہوجائے اور اس وقت بھی کوئی اپنی سابق بات پر اڑا رہے تو اس کے معنی یہ ہیں
اس میں اخلاص نہیں بلکہ محض ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ اگر اخلاص ہوگا تو اس کی واحد پہچان یہ ہے
کہ جس طرح وہ ایک غلط فہمی میں مخلص تھا اسی طرح صحیح فہمی میں بھی مخلص ہوگا۔ علم آجانے کے بعد
وہ کسی شخصیت یا فرقے کی بات سے چمٹ نہیں رہے گا۔ کیونکہ مخلص تو جویائے حق ہوتا ہے اسے
جہاں حق نظر آئے گا اسے لے لے گا۔

اخلاص اور غلط فہمی کا فرق

قرآن نے ان ہی اہل کتاب اور دوسرے مفکرین کی برائی کی ہے جنہوں نے حق کو پہچاننے اور سمجھنے کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ اگر حقیقت ان پر منکشف نہ ہوتی تو ایک غلطی پر اخلاص سے قائم رہنا غالباً اتنا بڑا جرم نہ ہوتا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص زہر آمیختہ شہد کو لاعلمی میں چاٹتا ہے اور دوسرا جان بوجھ کر چاٹتا ہے۔ مریں گے تو دونوں ہی لیکن دونوں کی نوعیت میں بڑا فرق ہوگا ایک غلط فہمی کا شکار ہے اور دوسرا خودکشی جیسے گناہ عظیم کا مرتکب۔ ایک ہمدردی کا مستحق ہے اور دوسرا سزا کا حقدار، ان دونوں میں ہر لحاظ سے وہی فرق ہے جو اوپر سے پھسل کر گرنے والے اور ایک خودکشی کے ارادے سے کودنے والے میں ہے۔ چوٹ دونوں کھائیں گے لیکن ایک بے گناہ ہوگا اور دوسرا مجرم۔ بالکل یہی صورت اخلاص اور ہٹ دھرمی کی ہے۔ مخلص اگر اخلاص کے ساتھ کسی غلطی پر قائم ہے تو اس کی نادانی اور بے وقوفی ہوگی۔ اور اگر خطا و صواب کی تمیز رکھنے اور حقیقت حال کو جاننے پہچاننے کے باوجود کوئی غلطی پر قائم رہتا ہے تو یہ ضد، ہٹ دھرمی، اور منافقت اور مجرمانہ حرکت ہوگی۔ غرض اخلاص بڑی عجیب نعمت ہے لیکن اس کی پرکھ اسی وقت ہوتی ہے جب حق واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ اس وقت مخلص غلط شے کو چھوڑ دے گا اور غیر مخلص اپنی غلطی پر اڑا رہے گا۔

وسیع تر للّٰہیت

ابن عربی کا اخلاص اپنے شیخ کے ساتھ سچا تھا اور قاضی صاحب سے ان کی نفرت بھی مخلصانہ تھی۔ لیکن جوں ہی ایک وسیع تر حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہوئی اسی وقت انہوں نے اپنی نفرت دور کر دی۔ اگر وہ اپنی نفرت سابقہ میں مخلص نہ ہوتے تو انکشاف حقیقت کے بعد بھی اپنی اسی نفرت پر قائم رہتے۔ لیکن یہ ان کا اخلاص ہی تھا جس نے نفرت کو محبت سے تبدیل کر دیا۔ اسی اخلاص کے لئے ایک دوسرا بلیغ و جامع لفظ للّٰہیت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: **من احب لله وابغض لله واعطیٰ لله ومنع لله فقد استکمل الایمان** وہ شخص کامل الایمان ہے جو محبت کرے تو اللہ کے لئے۔ بغض رکھے تو للّٰہیت کے ساتھ۔ دے تو للّٰہیت سے اور دینے سے باز رہے تو اخلاص کی بنا پر۔

بت پرستی کے نئے انداز

کے ایم اعظم

پہاڑوں کی کئی ایک چوٹیوں پر ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالکل قریب گرے ہوئے بارش کے قطرے مختلف دریاؤں سے ہوتے ہوئے، مختلف سمندروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات بنیادی دینی تصورات کی ہے کہ ان میں رخ کا ذرا سا فرق بالآخر تمام کے تمام دینی نظام فکر کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

شاید اس خطرے کے پیش نظر اللہ سبحان تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ وہ ہر رخ پر موجود ہے۔ مسلمانوں کے لئے عبادات اور فکر کا ایک ہی رخ متعین کیا ہے، جس کی کرہ ارض پر علامت کعبہ مکرمہ ہے، جو تمام مسلمانان عالم کا قبلہ ہے۔ یہ رخ محض ایک رسم کے طور پر ہی متعین نہیں کیا گیا، بلکہ اس کا ایک گہرا روحانی مفہوم ہے۔ ہر مسلمان کو قرآن کریم کے کلی پیغام کو سمجھتے ہوئے زندگی کے ہر شعبہ، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست میں ایک مخصوص صالح انداز کو اپنانا چاہیے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک صالح انسان کا طرز عمل اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔ اگر ہماری روحانی سمت ہی درست نہ ہوگی تو پھر ہمارے سارے کے سارے اعمال اور دینی مساعی رائیگاں جائیں گی اور دنیا کا ہر ضابطہ اور قانون بیکار ہو کے رہ جائے گا۔ قبلہ کی درستگی کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سوچ نہ صرف محدود دینی اور مذہبی امور میں ہی درست اور صحیح ہو بلکہ بڑے بڑے معاشی، معاشرتی، اور سیاسی مسائل میں بھی صحیح اور وسیع ہو۔

مگر اس کے برعکس ہوا یہ کہ قرآن مجید کی فقط چند ایک آیات پر ہی انحصار کر کے اپنا اپنا الو سیدھا کیا گیا اور مختلف دینی زعما نے مختلف عہدوں میں قرآن حمید ہی سے سرمایہ داری، اشتراکیت، زمینداری، جاگیرداری، ملائیت اور عسکریت کا جواز ڈھونڈ نکالا بلکہ خود پرستی کا یہ عالم رہا کہ اپنے اپنے سیاسی لائحہ عمل کو بھی قرآن ہی سے ماخوذ کیا گیا۔ اسلام کے نام پر اس سیاسی مفاد پرستی نے اسلام کو، بالخصوص گزرے ہوئے سامراجی دور میں، ایک عضو معطل بنا کے رکھ دیا۔ آج بھی فہم قرآن کے اس جزوی میلان اور دینی اکابرین کے ذاتی مفادات نے اسلام کو سیاسی اور مسلکی تنازعات میں گھیر رکھا ہے، اور اس کی ہمہ گیر قوت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کی باوجود اپنے

اپنے ناقص فہم قرآن، امور اسلام کی مسخ شدہ تصویر پر ان دینی امراء کو زعم یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ ان کا ہمہ وقت حامی و ناصر ہوگا حالانکہ ایک عرصہ دراز سے اللہ تعالیٰ نے ان پر خواری و مسکنت مسلط کر رکھی ہے گو وہ اس سے بے خبر ہیں۔ یہی دینی اکابرین گر چاہیں تو اللہ جل جلالہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر اور قرآن کے بنیادی تصورات، توحید، تقویٰ، عدل و احسان، مساوات و مواسات، میانہ روی، رواداری اور باہمی مشاورت کو اپنا کر کامیاب و فتح یاب ہو سکتے ہیں۔

اسلام کا امتیازی نشان اس کا توحید پر خصوصی زور ہے۔ بیشک توحید ہی باری تعالیٰ کا وہ ازلی اور فطری دین اسلام ہے جو کہ اس کا ہر رسول دنیا میں لے کر آیا ہے۔ توحید ہی وہ بنیادی تصور ہے جس سے تھوڑا سا انحراف بھی ہر قسم کی معاشرتی برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ اس مرکزی تصور سے ذرا سی روگردانی ہی طاغوتی یعنی فرعونی، ہامانی، قارونی اور آذری طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقعہ دیتی ہے، جن کے زیر اثر نہ تو مہذب معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صحیح اطاعت ہو سکتی ہے۔

ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت چونکہ ہندو نژاد ہے اور بت پرستی ان کے خون میں رچی ہوئی ہے، اس لئے وہ داخلی طور پر توحید کے مضمرات سے نا آشنا ہیں۔ تبھی تو علامہ اقبال نے کہا ہے:-

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ہندو پاکستان کے ترک نژاد مسلمان بھی بت پرستی سے گھائل ہو چکے ہیں بقول میر تقی میر۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو، اس نے تو
کشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اگر ہم قادر مطلق، حاضر، ناظر رب کا حقیقی شعور رکھتے تو ہمیں کسی بچھڑے یا تربوز کی جلد پر قدرتی طور پر اللہ کا نام کندہ دیکھ کر قطعی تعجب نہ ہوتا۔ اگر ہم واقع یہ یقین رکھتے کہ پوری کائنات اور اس کے بیچ موجود ہر شے اس کی بنائی ہوئی ہے، بلکہ ہمہ وقت اس کے ذکر میں مشغول ہے، تو ہمارے لئے ایسے اکا دکا نادر واقعات کسی حیرت کا باعث نہ بنتے۔

توحید کے صحیح قدر شناس نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ ادب کے نام پر کئی ایک قسم کی بے راہ رویوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ کاش ہم اسلام کے آداب و رسوم اپنے عرب بھائیوں سے ہی سیکھ

لیتے، کیونکہ وہ اسلامی اخلاق اور راہ ورسم سے جبلی طور پر آشنا ہیں۔ میرے اپنے لئے بھی عربوں میں قدرتی معاشرتی مساوات قابل دید تھی کہ ایک شاہی خدمت گار اپنے بادشاہ کو بے تکلف اس کے نام سے پکارتا ہے اور اس کے ساتھ کھانے میں شامل ہوتا ہے اور کسی وزیر اعظم کے لئے کوئی بھی اٹھ کے کھڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح صحابہ کرام بھی رسول عالی مرتبت ﷺ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ہم نے تو اپنے مزاج کے مطابق ادب رسول ﷺ کی بے شمار غیر معقول کہانیاں گھڑ رکھی ہیں، جن کا عرب تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کیا ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم صحابہ کبار سے بھی زیادہ رسول اللہ ﷺ کے محب ہیں۔ کیا ہم یہ شعور نہیں رکھتے کہ باادب ہونے کے لئے بت پرست ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہم نے ادب کے پردے میں خاتم الرسل ﷺ کے دین قیم کو ایک دیو مالائی مت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، جس میں وسیلوں، مصالحتوں اور روحانی سفارش کا ایک لمبا چوڑا انظام قائم ہے، جس نے اسلامی معاشرت کی شکل ہی بگاڑ کے رکھ دی ہے۔ ہمارے شیوخ، پیر اپنے مریدین اور سائلین کو اسلامی طرز پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے کے بجائے از راہ کرم ان کے کھانے پر الش کے ذریعے برکات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کے برہمن تو حید پرست تھے۔ مگر اپنے طبقاتی تعصب کی وجہ سے وہ نچلے طبقات کو اس بات کا اہل نہ سمجھتے تھے کہ ان کو خدا واحد کا علم ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مذہب کے ہر ربانی تصور کو مختلف اجسام میں ڈھال کر عوام کو توحید سے دور کر دیا۔ بلکہ کہنا تو یہ چاہیے کہ انہوں نے ایک ہی پتھر سے دو پرندے مار گرائے کیونکہ وہ ہندو عوام کے علاوہ مسلمان عوام کو بھی کسی حد تک گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بہر حال میں اسلام میں روحانیت کی اہمیت کو کم کرنے کا تاثر تو ہرگز نہیں دینا چاہتا۔ بلکہ میرے خیال میں تو اسلامی شریعت پر مسلمان اس وقت تک مکمل طور پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک روحانیت کے چشمے اس کے سینے سے نہ پھوٹیں۔ قرآن کریم بھی ہمیں اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ جب ہم ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں، جو صبح و شام اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں، تو صبر کے ساتھ بیٹھیں اور اپنی نگاہیں ان کے چہروں سے نہ ہٹائیں (۱۸:۲۸)۔ میرے کہنے کا مطلب تو اتنا ہی ہے کہ اسلام کی روحانیت کو اسلام کی حدود کے اندر ہی تلاش کرنا چاہیے۔ ہم شریعت اس

روحانیت میں درمیانہ راستہ اختیار کرنے کی بجائے متشدد رویہ اپنائے رہتے ہیں یا تو شرک کی حدود کو چھونے لگتے ہیں یا پھر روحانیت کے لئے بے ادبی کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنے کا کوئی جواز ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ ہمارے کچھ علماء تصوف کے اعلیٰ اخلاقی معیار سے خائف ہو کر بھی اس کی مخالفت کا جواز ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

بت پرستی کے کئی ایک انداز ہمارے معاشرے میں ہر سو پھیلے ہوئے ہیں۔ بلخصوص دینی سیاست کے میدان میں، جہاں دینی اکابرین یا تو اپنے آپ کو صنم کبیر کے طور پر پیش کرتے ہیں یا ہندو پروہتوں کی طرح اپنی دینی جماعت کے لئے ہر وقت خون و مال کا نذرانہ مانگتے رہتے ہیں۔ یہ دینی زعما خود پرستی کے عالم میں غلبہ اسلام کے لئے اپنے اپنے مخصوص نظریہ ہائے فکر کو آگے بڑھاتے ہیں، جو کہ عموماً ایک ناقص فہم قرآن پر مبنی ہوتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ زعما اس دین کے پھیلاؤ میں اللہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں جبکہ اللہ کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اسے کسی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تو صرف کہتا ہے، ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے (۳:۴۷)۔ اور وہ اپنے ارادے کو جس طرح چاہے اور جس پر چاہے مسلط کر سکتا ہے (۳:۲۶،۲۷)۔

دراصل ہمارے علماء کو خود پرستانہ اور ذاتی مفادات کی طرف مائل تفسیریں اور فقہی ترجیحات موجودہ دور کے بڑے بت ہیں۔ دینی جماعتیں اور فرقے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول عالی مرتبت ﷺ سے زیادہ توجہ اپنے لیڈر یا امیر کو دیتے ہیں ان کے اجتماعوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول عالی مقام ﷺ سے بڑھ کر ذکر ان کے اپنے حضرت یا مولانا کا ہوتا ہے۔ مختلف دینی جماعتوں اور تحریکوں کا یہ رویہ امت مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اور اصل میں یہی فساد کی جڑ ہے۔ ہر جماعت صرف اپنے آپ کو دین کا سچا محافظ خیال کرتی ہے۔ اور ان جماعتوں کے کارکنوں کا خود ستائی و پارسائی کا مغرورانہ رویہ مسلم عوام کو اپنے دین سے دور کر رہا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ مولانا حضرات امت کو متحارب فرقوں میں بانٹ کر ان ہی میں تفرقہ ختم کرنے کے لئے روز بروز آپس میں ملتے بھی رہتے ہیں۔ شاید ہمارے ایسے ہی زعما کے لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے ان کو گمراہ کرنے کے لئے میری یہ کتاب ہی کافی ہے (۳:۷)۔ ان دینی زعما کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں (۲:۶۱)۔ اور

عوام سے جھوٹے وعدے فرما کے اپنے آپ کو اور اپنے دین کو بدنام کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں وہ اہداف اور اسباب میں تمیز کرنے سے قاصر رہتے ہیں، مثلاً اس دور میں ان کی اولین توجہ ربا کے خاتمے پر مرکوز رہتی ہے حالانکہ ربا کا خاتمہ ان کئی طریقوں میں سے ایک ہے، جن کو ایک عدل و مساوات پر مبنی اسلامی معاشرہ کے قیام کے سلسلے میں بروئے کار لانا ہوگا۔ ان کو اس امر کا بھی شعور نہیں کہ باری تعالیٰ پر ایک پر جوش ایمان کی حدت سے اسباب پگھل کر اللہ والوں کے قدموں میں آ گرتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفرین، کار کشا، کارساز

(اقبالؒ)

اگر ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور حکومت پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں کئی مدو جزر آئے۔ گو اس طویل دور میں ملک ہمہ وقت اسلام کی درخشاں ہستیوں سے فیض یاب رہا، مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی کسی ایک جماعت کی داغ بیل نہ ڈالی، اور نہ ہی سرفرازی اسلام کے لئے کوئی تحریک چلائی۔ مگر ان ہی علماء فقہا اور صوفیاء نے اپنے اخلاق، تقویٰ اور بے غرض ایثار کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو گرماتی ہیں اور ان کے ایمان کو جلا بخشتی ہیں۔ شاہان وقت اور امرائے ریاست کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر انہوں نے ان کی سرزنش کرنے سے کبھی گریز نہ کیا، جبکہ اس دور کے علماء اور فقہا دربار حکومت میں اپنی رسائی کو ہی اعزاز سمجھتے ہیں۔ ایک وہ تھے کہ انہوں نے کبھی دربار شاہی کا رخ نہ کیا بلکہ حکمران وقت خود ان کے دروں پر کھڑے رسائی کے طلب گار رہے۔ اکبر جیسا جلیل القدر بادشاہ ننگے پاؤں چل کر شیخ سلیم چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوا۔ شیخ احمد سرہندیؒ "المعروف مجدد الف ثانیؒ" نے اپنے مرید افغان سپہ سالار کو یہ کہہ کر ہندوستان سے واپس بھیج دیا کہ فقیر تخت کا نہیں، فقط اصلاح کا طلب گار ہے۔ حمید الدین ناگوریؒ نے شدید فقر کے حالات میں بھی سلطان التمش کی بھیجی ہوئی پانچ صد اشرفیوں کی تھیلی یہ کہہ کر واپس کر دی کہ یہ کہیں ان کی آخرت کی کمائی ضائع نہ کر دے۔ بے شک یہ اللہ والے صرف اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور

بادشاہان وقت ان سے ڈرتے تھے۔ جبکہ اس دور کے ہمارے دینی زعما وقتی حکمران سے خائف ہیں ،جن کو اللہ کا خوف نہیں۔

ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں **1857**ء سے پہلے کیوں نہ کوئی پارٹی تھی اور نہ ہی کوئی فرقہ۔ دراصل ہمارے زعما یورپی ترقی ،قوت اور تسلط سے بہت مرعوب تھے۔ اس لئے ان کی سوچ کا رخ مغرب ہی کی طرف تھا۔ ان کا مطمع نظر یورپ کی تقلید کر کے اس ہی کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہونا تھا۔ وہ اپنی قوم کی دنیاوی نجات مغربی طرز فکر اور مغربی اداروں میں تلاش کر رہے تھے۔ اس طرح ان کا نعرہ رجوع الی المغرب تھا نہ کہ رجوع الی اللہ۔ ہاں ان میں سے جو کچھ غیرت رکھتے تھے، انہوں نے حکمران برطانیہ اور اس کی جمہوری روایت کی بجائے جرمنی اور فاشزم کی طرف رجوع کو زیادہ پسند کیا۔ ان کے مغرب کی طرف فکری جھکاؤ نے ان کو آئیڈیالوجی اور اس کی اساس پر غلبہ اسلام کے تصور سے روشناس کروایا۔ یہ اسی سیکولر فکری روایت کا اثر ہے کہ ہمارے دینی زعما اب تک سسٹم یا نظام کی بات کر رہے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس بالکل نہیں کہ ایک مسلمان کے لئے اس کی باطنی اور ظاہری طاقت کا راز تعلق باللہ میں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر ان کے حکمرانوں کا اللہ کے ساتھ تعلق برحق تھا، تو ہر قسم کے سیاسی نظاموں یا اداروں نے اچھے نتائج پیدا کئے اور جب کبھی یہ تعلق ماند پڑ گیا تو کوئی بھی ادارہ بشمول خلافت اچھے نتائج پیدا نہ کر سکا۔

ہمارے اکابرین کی اس فکری روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو پاکستان کے مسلمان نظریاتی، معاشرتی، اور روحانی بحران کا شکار ہو گئے جس سے ہم آزادی کے پچاس سالوں بعد بھی نکل نہ پائے۔ شاید ہمارے دینی اکابرین کو تاریخ کا ایک ازلی سبق یاد نہیں رہا کہ وہ قومیں جو موت سے نہیں ڈرتی، اللہ انہیں حکمران بنا دیتا ہے، اور وہ قومیں جو موت سے ڈرتی ہیں انہیں محکوم۔ دراصل توحید ہی انسانوں کو صحیح معنوں میں آزاد کرتی ہے اور وہن (یعنی دنیا سے محبت اور موت کا ڈر) ان کو غلام بنا دیتا ہے۔ جب تک ہم پاکستانی اپنے دلوں کو اس ازلی حق سے آشنا نہ کر لیں گے، ہم ذہنی غلامی، حلقہ بگوشی محتاجی اور اطاعت غیر کے گورکھ دھندوں میں مقید رہیں گے۔

ڈاکٹر خالد شیلڈرک

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

ڈاکٹر خالد شیلڈرک نے 1903ء اس وقت اسلام قبول کیا جب ان کی عمر صرف 17 برس تھی اور وہ مذہب عیسوی کی تبلیغ کی تعلیم وتربیت حاصل کر رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان پر عیسائی مصنفین کی خلاف اسلام کتابوں کی وساطت سے اسلام کی حقانیت واضح ہوئی۔ جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو ان کے والد نے انہیں گھر سے نکال دیا، لیکن نوجوان خالد نے راہ حق میں ہر طرح کی صعوبتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور تن دہی سے اسلام کی روشنی کو دوسرے ذہنوں میں اتارنے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ ان کے اخلاص، طرز تبلیغ اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انگلستان کے بہت سے ذہین اور معروف لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ایسے خوش نصیب اصحاب میں سے چند نام یہ ہیں۔ ولید بنسٹڈ (1904ء) احمد براؤننگ (1905ء) عمر فلائٹ (1906ء) عمر رچرڈسن (1915ء) ایک روسی جرنیل، بیرن ہوون (1920ء) ایل جے محمد ہل (1920ء) ریورنڈ جے منیارڈ آف نیویارک (1924ء) عبداللہ ڈے (1925ء) بلال اینڈ ریوز (1926ء) رائل ایئر فورس کے ولید ڈانسن (1927ء) ساراواک کی شہزادی ہر ہائی نس خیر النساء گلیڈز پالمر (1932ء) خالد کنراڈ سیملبن (1932ء) انجینئرنگ کالج بنڈونگ جاوا کے پروفیسر کمال شومیکر (1924ء)

ڈاکٹر خالد زبردست صلاحیتوں کے حامل معروف صحافی بھی تھے۔ اسلامی جرائد میں ان کے بے شمار مقالات شائع ہوئے۔ انہوں نے "مینارہ" کے نام سے خود بھی ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے مسلسل تبلیغی سفروں اور مالی دشواریوں کی وجہ سے چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مشرق بعید، ہندوستان اور شرق اوسط کے بہت سے سفر کیے اور لندن میں ایک مستقل تبلیغی ادارہ "ویسٹرن اسلامک ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کیا۔ ڈاکٹر شیلڈرک اس کے تاحیات صدر اور بہت سی نامور مسلم ہستیاں اس کی رکن تھیں۔

ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی دو تقریروں کا متن دیا جا رہا ہے جن میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کی وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں پہلی تقریر انہوں نے قاہرہ میں جمعیت شبان المسلمین کے اجتماع میں کی تھی۔

☆☆☆

"میں اپنے خطبہ کا آغاز کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جذبات مسرت کا تقاضا یہی ہے۔ میں نے دین اسلام کافی غور وفکر کے بعد قبول کیا ہے اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے اس دین کی تعلیمات پہلے پہل اس کے موافقین کی کتابوں سے نہیں بلکہ اس کے مخالفین کی تصانیف سے حاصل کی ہیں۔

میں برطانوی والدین کے گھر پیدا ہوا جو پروٹسٹنٹ چرچ سے وابستہ تھے۔ میرے والد کی آرزو تھی کہ وہ مجھے اس چرچ کا ایک پادری دیکھے، اس لئے مجھے دینی کتب کا مطالعہ اور مذہبی موضوعات پر مباحثہ میں مصروف دیکھ کر اسے بہت مسرت ہوتی۔

یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان بظاہر عیسائیت کا پیرو ہے، لیکن نوے فیصد انگریز عیسائیت سے ناواقف ہیں۔ اور میں بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں خود اپنی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی عیسائیت کے مزعومہ اصولوں کا قائل نہ ہوسکا۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ خدا کی ذات واحد تین شخصیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جسے عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ اور بیٹا ہر زمانے میں ساتھ ساتھ موجود ہوں۔ جس کسی زمانے میں آپ کا وجود فرض کرلیا جائے بیٹے کا وجود بھی اس کے ساتھ لازم ہو۔ یہ ایک ناقابل فہم عقیدہ ہے جسے کوئی عقل سلیم کا مالک قبول نہیں کر سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ عیسائی اس عقیدے کو سمجھے بغیر سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائی 25 دسمبر کو مسیح علیہ السلام کا یوم ولادت مناتے ہیں، حالانکہ اس خیال کی تائید میں وہ مسیح کی کسی ہم عصر یا کم از کم قریب العصر شخصیت کی سند پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ ایک پوپ کی دماغی اختراع ہے جس کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں بلکہ اصول حساب کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ 25 دسمبر قدیم بت پرستوں کا ایک مقدس دن تھا۔ یہ لوگ سورج دیوتا کے پجاری تھے چنانچہ ان کا دیوتا..... سورج.... جسے یہ مصدر وجود اور چشمہ حیات سمجھتے تھے جب انقلاب سرمائی کو ختم کرلیتا تھا تو اس سے اگلے دن وہ عید مناتے تھے اور اسے اپنے دیوتا کا یوم ولادت مانتے تھے۔ اسی عقیدہ ولادت شمس کو عیسائیوں نے عقیدہ ولادت مسیح میں تبدیل کردیا اور بت پرستوں کے قدیم دستور کے مطابق 25 دسمبر کو یوم عید قرار دیا ہے۔

اسی طرح بت پرست اعتدال ربیع کے اگلے دن بھی عید مناتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آج ان کے خدا.... سورج دیوتا..... نے اس تاریکی پر فتح پائی ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوگئی

تھی اور اب اس کی طاقت اور روشنی میں اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ پرانے بت پرستوں کی پیروی
جس طرح عیسائیوں نے یوم ولادت مسیح میں تبدیل کر کے اسے عید مانا تھا، اسی طرح انہوں
یوم اعتدال ربیع کو جو دراصل سورج دیوتا کے طاقت پانے کا دن تھا، مسیح کے طاقت پانے کا
قرار دے کر اسے عید القیامہ (ایسٹر) بنالیا۔

اسی طرح باپ بیٹے کا مسیحی عقیدہ بھی قطعی پرانے بت پرستوں کے عقائد سے ماخوذ ہے،
کا ثبوت یہ ہے کہ بدھ مت کے ماننے والے بدھ کے بچپن کے زمانہ کی تصویر اس کی ماں (
کے ساتھ جس انداز سے بتاتے ہیں، بعینہ اسی انداز کی تصویر مسیح کے زمانہ طفولیت کی، ان کی ماں
مریم کے ساتھ ہم گرجوں میں منقش پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی وہ شخصیت جس
عیسائی دعوے دار ہیں، کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ناقد علمی طریقے سے اس موضوع
بحث کرے تو اسے کلی طور پر مایوس ہونا پڑے گا۔ اس کا اندازہ آپ مسیح کی اس تصویروں سے
سکتے ہیں جو مختلف ممالک میں مختلف انداز میں ملتی ہیں۔ آسٹریا کے گرجوں میں مسیح کی جو صور
منقش ہے وہ اٹلی کے گرجوں کی تصویروں سے خاصی مختلف ہے، وعلیٰ ہذ القیاس، چنانچہ خاصے غور
وفکر کے بعد بھی مسیح کی ان فرضی تصویروں سے ان کی اصل صورت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا
چنانچہ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیوں کے مختلف طبقوں میں عیسائیت کے اصولوں اور
کی ذات کے متعلق بنیادی اختلافات ہیں اور کوئی بھی غیر جانبدار قاری معمولی مطالعے سے ان
ادراک کر سکتا ہے۔

یہ تھیں وہ بنیادی الجھنیں جنہوں نے مجھے دیگر مذاہب کے مطالعے پر آمادہ کیا۔ چنا
مذاہب عالم پر انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی کتابیں بھی ملیں، میں نے وہ پڑھ ڈالیں
اس مرحلے میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں یہودیت، ہندومت، بدھ مت
وغیرہ کے بارے میں تو صرف معلومات ہی تھیں، مگر اسلام کا جہاں بھی ذکر آتا تھا کوئی بھی مصنف
طعن و تشنیع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کتابوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلام بذا
کوئی مستقل مذہب نہیں ہے بلکہ وہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔

قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر واقعی اسلام ایسا بے حقیقت مذہب ہے جیسا
ہمارے مصنفین ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس قدر اعتراضات، طعن و تشنیع اور شور و واویلا کی
ضرورت کیوں ہے اس کے مقابلہ و مدافعت پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ اس احساس نے غور
کی راہیں مزید کھول دیں اور یہ بات میرے دل میں بیٹھتی چلی گئی کہ اگر عیسائی مصنفین مذہب

اسلام سے خائف نہ ہوتے اور اس کی قوت وحرکت سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ ومجادلہ کی اس قدر فکر نہ کرتے، نہ اٹھتے بیٹھتے اس کی توہین وتذلیل، کے در پے ہوتے۔ چنانچہ اب میں نے طے کرلیا کہ اسلام پر خود مسلمانوں کی کتابیں پڑھوں گااور اسے اس کے صحیح آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرونگا۔

چنانچہ میں نے سارا وقت اسلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگا دیا اور خدا کا شکر ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ میں نے خوب دیکھ لیا کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ قطعی بے بنیاد ہے۔ اسلام ہی دین فطرت ہے اور سلامت طبع رکھنے والا کوئی فرد بھی اس سے زیادہ عرصے تک دور نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ ترکی کے دارالخلافہ میں ایک مسجد یا صوفیہ ہے اور وہ اسلامی تبلیغ کا مرکز ہے۔ میں نے اس مسجد کے پتے پر اپنے حالات استنبول لکھ بھیجے۔ میرا یہ خط سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کیا گیا اور سلطان المعظم کے سیکرٹری نے مجھے جواب دیا کہ میں مشہور نو مسلم انگریز شیخ عبداللہ کوئیلم (بیرسٹر) سے ملاقات کروں۔

برادران اسلام! آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک انگریز مسلمان سے مل کر میرے جذبات مسرت کا کیا عالم ہوگا۔ میں نے ان سے اپنے دل کا حال بیان کیا اور آزادی کے ساتھ اپنے عقائد اور خیالات کا اظہار کیا۔ شیخ عبداللہ کوئیلم نے مجھے سینے سے لگالیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اسلامی برادری کا رکن بن چکا تھا۔ شیخ موصوف کی شخصیت اور محنت کے نتیجے میں انگلستان میں پانچ سو سے زائد انگریز مسلمان ہوئے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے قبول اسلام کی اطلاع اپنے والد کو دوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں عیسائیت کو خیرباد کہنے سے تو کوئی رنج نہ ہوا، مگر میرے قبول اسلام کی خبر سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگی اور ان کے ساتھ خاندان نے شدید صدمہ محسوس کیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے فیصلے کو واپس لے لوں، مگر میں نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اسلام کے دامن کو تھامے ہوئے پینتیس سال گزر گئے ہیں اور اسلام پر میرا یقین بڑھتا ہی چلا گیا۔ آج میں پہلے کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کا زیادہ معتقد اور اس کے محاسن وفضائل کا زیادہ معترف ہوں۔ الحمدللہ! میں اس کے احکام پر عمل بھی کرتا ہوں۔ میں ولی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا مگر یہ ضرور ہے کہ اسلامی فرائض کو ادا کرنے میں حتی الامکان کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

آخر میں، میں اپنے اس یقین کا اظہار کرونگا کہ انشاءاللہ ایک دن تمام دنیا دین اسلام کا پرچم

تھام لے گی۔ مگر یہ اس امر پر موقوف ہے کہ اسلام کے نام لیوا اسلام کا عملی نمونہ بنیں اور اصول اسلام کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے دوران میں، میں نے محسوس کیا ہے کہ مسلم اکثریت کے ملکوں میں ضعف، بے عملی، پست ہمتی اور افتراق کا غلبہ ہے اقلیت والے ملکوں میں مسلمان دینی تعلیمات کی پیروی اور عمل میں (جو قوت و ترقی کے اسباب ہیں) نسبتاً بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان اپنے دین کی پیروی کریں اور ان کی سیرت پر اسلام کی عظمت کے آثار نمایاں ہوں تو یہ اسلام کی ایک عملی تبلیغ ہوگی جو غیر مسلم اقوام عالم کو اسلام کے اصولوں کا گرویدہ بنا دے گی۔

(2)

مجھے اپنے والدین کے حکم سے چرچ آف انگلینڈ کے قواعد کی سختی سے پابندی کرنا پڑتی تھی۔ سات سال تک میں گویا بنا رہا۔ ہمارا پادری ایک ایسا شخص تھا جس کی میں اب بھی ہر طرح سے عزت کرتا ہوں۔ وہ راست باز، متحمل مزاج، چشم پوش، صادق الوعد تھا۔ لڑکپن کے زمانہ میں مذہب کی طرف سے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچا۔ میری عبادت گویا خودکار آلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بعد مجھے دنیا کی مصروفیات نے آن گھیرا اور بالکل نئے علائق سے واسطہ پڑا۔ میرے بچپن کے ساتھی دہریہ اور رومن کیتھولک عیسائی تھے۔ اس لئے میرے اور ان کے درمیان روز مرہ مباحث کا سلسلہ گرم رہتا۔ ان مباحث میں پہلی دفعہ میرے عقائد پر حملہ ہوا چونکہ میں بہت حد تک متزلزل ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے رفقاء کے اعتراضات کو دور کرنے کے لئے تحقیق و دریافت کرنے کی قسم کھائی۔

اس تردد اور پریشانی کی حالت میں میں نے پڑھنا اور مسیحی درسوں میں جانا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں کئی ایک بیان کردہ اقوال پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں نے ردعیسائیت کی کتب کا مطالعہ کیا جس سے میرا ایمان خطرے میں پڑ گیا۔ میں مقدور بھر تمام مذہبی فرقوں میں جا کر ان کا مطالعہ کرتا اور ان سب کی تواریخ اور تعلیمات پر غور کرتا رہا۔ اس جدوجہد میں صرف ایک فرقہ نے میری توجہ کو کھینچا۔ یہ یونیٹرین چرچ کا فرقہ تھا۔ تاہم میں تثلیث کا پہلے سے معتقد ہونے کے باعث ضد اور ہٹ کی وجہ سے ابھی تک نہایت شوق و مستعدی بلکہ سرگرمی سے اسی آرزو میں مطالعہ کرتا رہا کہ مجھے پختہ یقین ہو جائے کہ عیسائیت ایک سچا مذہب ہے اور دوسرے مذاہب باطل ہیں۔ میں ابھی تک دوسرے مذاہب اور فرقوں کے بالکل خلاف تھا اور میرے اس مطالعہ میں تنگ دلی، کم ظرفی اور خشک مزاجی کا رنگ غالب تھا۔ مگر آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ مذہب

جسے میں نے اپنی فطرت اور عقل کے مطابق ہونے کی وجہ سے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے، عیسائی گرجوں کی تعلیم سے مختلف ہے۔ سب سے پہلے میں نے محسوس کیا کہ گرجوں نے مجھے تعلیم دی ہے کہ میں گناہ کی وجہ سے عمل میں آیا ہوں اور یوں انہوں نے میرے قریب ترین اور سب سے زیادہ پیارے رشتہ دار والدین کی سخت توہین کی ہے۔ میں نے پڑھا کہ وہ دونوں میری پیدائش کی خاطر ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بھلا میں اس بات کو مان کر ان کا بیٹا کہلا سکتا تھا؟ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میں خود فطرتاً گنہگار ہوں اور میں گناہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے میں اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق بہت زیادہ گناہ کر کے ایک بہت بڑا گناہگار بن کر خدا تعالیٰ کی رضا کا موجب ہونگا کہ اس نے گناہ میری فطرت اور خلقت کا ایک لازمی جزو بنایا ہے۔ انسانی سرشت کا یہ نقشہ کس قدر بھدا، بھیانک اور مضحکہ خیز ہے اور اس انداز فکر میں خالق حقیقی کی تدبیروں کی کیسی تحقیر و توہین کی گئی ہے۔ نیز خود اللہ تعالیٰ پر کتنا بڑا افترا اور کفر باندھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میں گناہ گار ہونے کی وجہ سے تا حال دوزخ کا ایندھن ہوں، جس کی تصویر کھولتے ہوئے پانی اور گندھک کی وجہ سے بڑی مہیب اور ڈراؤنی ہے۔ اگر میں پتسمہ لئے بغیر مر جاؤں تو میرے بچاؤ کی خواہ میں معصوم بچہ ہی کیوں نہ ہوں، کوئی صورت نہ ہوگی اور میری روح فنا کر دی جائے گی۔ یہ عقیدہ اسلام کی اس تعلیم کے کس قدر خلاف ہے جو بعد میں مجھے معلوم ہوئی کہ تمام بچے فطری مذہب کے خواص لے کر پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کے ماں باپ انہیں عیسائی، یہودی یا ہندو بنا لیتے ہیں۔

پیغمبر خدا ﷺ کی اس حدیث سے عیسائیوں کے اس متذکرہ صدر اعتقاد کی کافی تردید ہو جاتی ہے۔ مجھے بائبل کی مختلف آیات سے معلوم ہوا کہ خداوند خدا، رحیم و کریم خالق نہیں بلکہ ایک خونخوار دیو ہے جس نے ایک ادنیٰ اور حقیر انسان کی عامہ خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تمام انسانیت کو تباہ کر دینا چاہا۔ مجھے یہ اعتقاد رکھنے کی تلقین کی گئی کہ خدا تعالیٰ بنی نوع انسان کو پیدا کرنے کے لئے یہاں تک اس کام کو بگاڑا کہ اس نے یہودیوں کے سوا تمام دوسری قوموں کو تباہ کر دینا چاہا۔ اسی خیال کی بناء پر یہ فرضی حکم بھی اس کی پاک ذات کی طرف منسوب کیا گیا جو گویا اس نے یہودیوں کی برگزیدہ قوم کو دیا اور انہیں کہا کہ بنی نوع انسان میں سے ہر ایک فرد کو قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ رہنے دو۔ کیا میں اس بات پر یقین لا سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، کبھی نہیں! خدا ان لوگوں کو معاف کرے جو اس کی طرف ہجو کرتے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار پیغمبر دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے مگر انسان ضدی واقع ہوا ہے اس لئے اللہ

تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ابدی جہنم میں دھکیلنا چاہا، جس سے نجات کی صرف ایک ہی شرط تھی جو یوں پوری کی (نقل کفر کفر نباشد) کہ خداوند کے اکلوتے بیٹے نے نسل انسانی کی حمایت کی اور خداوند باپ اس پر رضامند ہوگیا کہ اس کا بیٹا بطور قربانی ہلاک ہو جائے اور اس کے معصوم کندھوں پر تمام دنیا کے گناہوں کا بوجھ لاد دیا جائے۔ اس عقیدہ سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ خداوند اپنے انسانیت پرست بے قصور بیٹے کے قتل کا مجرم ہے مگر اس نے اس جرم کا ارتکاب کیوں کیا؟ صرف اپنے اندھا دھند غیظ و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے!

اس عقیدہ کے بانیوں نے خدا کو ظالم اور قاتل کی صورت میں پیش کیا ہے۔ پھر یہ عقیدہ کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ خداوند تعالیٰ کا اکلوتا فرزند یسوع مسیح اس شرط پر کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا کہ وہ اس کے نجات دہندہ خون پر ایمان لے آئے اور اس وقت پر گیت گایا جاتا ہے کہ "برہ کے خون سے پاک کیا گیا" وغیرہ وغیرہ۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی پادری یا کفارہ کے معتقد نے کسی مقتل میں جا کر خون سے غسل کیا ہو اور پھر وہ پاک ہوگیا ہو۔ یہ بہت ہی قابل نفرت بات ہے اور جہالت کی یادگار ہے جو بیسویں صدی کے دل و دماغ کے شایان شان نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آج کا پڑھا لکھا انسان اس پر کیونکر ایمان لا سکتا ہے۔ پھر یہ عقیدہ کہ باری تعالیٰ نے کوئی بیٹا اپنا متبنیٰ بنایا اور اس کو انسانی خواہشات عطا کیں۔ یہ بھی میرے خیال میں ایک کلمہ کفر ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی شخص اس بناوٹی عقیدہ پر ایمان نہ لائے تو اسے موردِ تعزیر خیال کیا جاتا ہے۔

ان اعتقادات کی رو سے خدا تعالیٰ گویا (نعوذ باللہ) اپنے بیٹے اور نسل انسانی کا سخت ترین دشمن ٹھہرتا ہے۔ انسان کو فطرتاً گنہگار پیدا کرنا خود اسے بھی ہوا و ہوس کا ہی شکار ثابت کرتا ہے۔ وہ تو ایک ایسا سخت فطرت خالق نظر آتا ہے جو انسان کو بھی کبھی میسر نہیں آئی ہوگی۔ کیونکہ ایسا کون باپ ہوگا جو اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے جان بوجھ کر اپنے ہی بیٹے کو قتل کر دے۔ میں نے دیکھا کہ جس وقت عیسائی مذہب بڑے عروج پر تھا تو ہر شخص جو اپنی تسلی اور اطمینان کی خاطر ان عقائد پر جرح قدح کرتا، یا تو اسے آگ کی نذر کر دیا جاتا یا قید کر دیا جاتا۔ بائبل کی تاریخ اور واقعات تدوین سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ نامعلوم الاسم مصنفین کا مجموعہ ہے۔ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا وغیرہ ان اناجیل کے مصنف نہیں جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بائبل میں بہت کچھ دستبرد اور تخریب و تبدل ان چند سالوں میں بھی عمل آیا ہے۔ مزید برآں عیسائی مذہب کبھی بھی تحمل و بردباری اور برداشت کا... مذہب ثابت نہیں ہوا۔ جونہی شہنشاہ قسطنطنیہ نے اس مذہب کو قبول کیا۔ اس وقت سے ہم دیکھتے ہیں کہ تثلیث پرستوں نے غیر مسیحیوں کو نہایت

بے رحمی سے دکھ دینے شروع کر دیئے۔ الغرض جب کبھی اس مذہب کو عروج حاصل ہوا ہے تو جس کسی نے اس کے ساتھ اختلاف رائے کے اظہار کی جرات کی اسے سخت مصائب کے شکنجہ میں کسا گیا ہے۔

متذکرہ بالا تمام باتوں نے میرے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ کلیسا کو پیشتر اس کے کہ وہ یسوع اور اس کی تعلیم پر کچھ بتائے، بائبل کے ان اصلی نسخوں کو تلاش کرنا چاہیے جو فی الحقیقت ان ایام کے پیغمبروں اور مرسلین کے تصنیف کردہ ہیں ورنہ ایک نامعلوم اور غیر معتبر کتاب کو یسوع کے مشن کی شہادت میں پیش کرنے کی وجہ سے عیسائیت ایک غلط مذہب ثابت ہوتا ہے۔

مجھے ڈبلیو سٹوارٹ راس جیسے زبردست مصنف سے جو صلاح الدین غازی اسلام کا اس قدر مداح ہے کہ اس نے اپنا تاریخی نام بھی صلاح الدین رکھا، ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس نے بیان کیا کہ "اگر خدا موجود ہے تو وہ اس تصور سے جو عیسائیت نے پیش کیا ہے بلند اور اعلیٰ تر ہے اور اگر اس عالم میں کسی اعلیٰ طاقت (خداوند تعالیٰ) کی ہستی ممکن ہے (اور میں اس سے کبھی منکر نہیں ہوا) تو وہ ان عاجزانہ اور غریبانہ تصویروں سے کہیں بڑھ کر ہوگی جو بائبل نے پیش کی ہیں پھر اگر خدا تعالیٰ کی شکل وصورت کے عین مطابق اس کا صحیح انعکاس ہماری فطرت میں ہے تو وہ اعلیٰ نقشہ اسلام نے ہمارے آگے پیش کیا" اس زبردست اہل قلم کے ذریعہ میں نے بدھ مت کا بھی مطالعہ کیا۔ مگر وہ مذہب مذہب نہیں بلکہ نرا خشک فلسفہ ہے۔ ایک کشکول ہاتھ میں لے کر بدھ مت کے بھکشو کی طرح دربدر بھیک مانگتا پھرے یا یسوع کی طرح دشت نوردی میں زندگی بسر کرے تو آج کا کوئی انسان اس پر عامل ہوگا.....؟ نہیں آج اسلام جیسے مذہب کی ضرورت ہے جو انسان کو زندگی کی باوقار اور معزز راہیں دکھائے۔

مجھے ایسے مذہب کی ضرورت تھی جو قابل عمل ہو۔ نرے فلسفہ، محض خیالات اور صرف خوابوں کا مذہب نہ ہو، نہ اس کو اپنا کر دوسرے لوگوں سے قطعہ تعلق کرنا پڑے اور مجھے ایک ایسے دستور العمل کی ضرورت تھی جس پر چل کر میں ہر آن دوسروں کے لئے اور اپنے لئے مثالی نمونہ بن جاؤں۔ میں نے اس غرض کو پورا کرنے کی لئے دوسرے مذاہب کا بغور مطالعہ کیا۔ بالآخر مجھے معلوم ہوا کہ میرے اپنے خیالات جو ایک عقیدہ کی صورت میرے ذہن نشین ہو گئے تھے، ہو بہو اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر اس وقت پہنچا تھا جب کہ ابھی تک میں نے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی نہ کسی مسلمان سے ملاقات کا موقع میسر آیا تھا۔ میں نے اسلام پر عیسائی مصنفین کے متواتر حملوں کو دیکھا اور اپنے آپ سے سوال کیا" یہ لوگ اسلام سے

اتنے خائف کیوں ہیں؟ اسلام نے وہ کونسی تعلیم دی ہے، جس کی وجہ سے وہ کلیسا کا زبردست دشمن ٹھہرا ہے "میں نے جہاں تک ہو سکا تمام کتابیں حاصل کیں مگر وہ سب کی سب عیسائی محققین کی لکھی ہوئی تھیں، انہی کتابوں سے اپنے دل میں اصل معاملہ کو حل کر لینے کے بعد دس سال قبل اس حقیقت پر پہنچ گیا کہ اسلام برحق دین ہے اور پہلا مسلمان، جس سے مجھے ملنے کا شرف حاصل ہوا وہ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی تھے۔ جنہوں نے خود بھی عیسائیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنے اور نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد میرے تمام شکوک رفع ہو گئے اور میں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسلام عروج اور ترقی کی طرف لے جانے والا مذہب ہے، اس لئے دنیا کو بھی اس عروج کی طرف جانا اور روشن ضمیر ہونا چاہیے تاکہ وہ پاک وصاف اور اعلیٰ کردار کی مالک ہو جائے۔ دوسری طرف عیسائیت کا جہاں تک تعلق ہے، اس نے ہمیشہ لوگوں کے فہم و ادراک کو کچلنے اور دبانے کی کوشش کی ہے اور اسے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ یسوع کی زندگی کا بھی کوئی حال معلوم نہیں اس لئے ہم ان سے بھی کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ایک ایک دن کا حال ہم پر پورے طور پر منکشف ہے۔ تیرہ برس تک آپ ﷺ کو طرح طرح کے دکھ اور اذیتیں دی گئیں۔ آپ نے صبر و استقلال اور برداشت کی عمدہ مثال قائم کی۔ پھر غالب آ کر بھی ایسی حالت میں جبکہ آپؐ کے دشمن آپؐ کے قدموں میں پڑے تھے اور آپ کو اپنا انتقام لینے اور ان کو تباہ و برباد کر دینے کا پورا اختیار حاصل تھا، آپؐ نے ان سب کو معاف کر دیا۔ کوئی شخص رحمدل اس وقت کہلا سکتا ہے جب اسے انتقام لینے کا پورا موقع اور طاقت میسر ہو اور وہ معاف کر دے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کو غرور کا احساس تک بھی نہ تھا کیونکہ آپ ﷺ حکمران کی حالت میں بھی خود اپنے گھر میں جھاڑ دیتے اور خود اپنی جوتیاں گانٹھتے تھے۔ آپؐ نے اپنا تمام مال و دولت محتاجوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کر دیا اور آپ ﷺ کی زندگی پیدائش سے لے کر رحلت تک دنیا کے لئے نمونہ تھی۔ اسلام نے ہمیں ایثار اور نیک کاموں کی ہدایت کی ہے۔ یہی وہ پاکیزہ شعار ہیں جو ہمیں بہشت کا وارث بنا سکتے ہیں۔ نرا زبانی ایمان اور اقرار کسی کام کا نہیں اگر اس کے ساتھ نیک اعمال نہ ہوں۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور تمام انسانوں کی باہمی اخوت برادری اسلام کے ہمہ گیر بےنظیر اصول ہیں۔ یہ ایسے اصول ہیں، جس پر مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیے۔ مجھے مسلمان ہونے پر کبھی بھی کوئی افسوس نہیں ہوا اور نہ میں خدا اور اس کے پاک رسول ﷺ کا دامن پکڑنے پر کبھی شرمندہ ہونگا۔

ہارون یحییٰ

ترکی کے معروف سکالر جناب عدنان اختر "ہارون یحیٰ" کے قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ عدنان اختر 1956ء میں انقرہ میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کے اختتام تک وہ انقرہ میں ہی مقیم رہے۔ اس عمر میں عدنان اختر مذہبی اور علمی موضوعات پر ڈھیروں کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے میں شروع سے ہی سرگرم رہے۔ 1979ء میں عدنان اختر استنبول آئے اور میمار سینان یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور یہاں لوگوں کو اللہ کی عظمت اور صراط مستقیم تک لانے کے لئے تحریکی انداز میں کام کا آغاز کیا۔

میمار سینان یونیورسٹی کے ماہ و سال

عدنان اختر کی خدمات اور کام کا اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب تک ہم ترکی کے سیکولر روپ کو اچھی طرح نہ دیکھ لیں۔ ماضی میں یہ شاندار سلطنت عثمانیہ کا مرکز تھا اور اب یہ حال ہے کہ مذہب بیزاری عام ہے۔ اللہ کا نام لینا گویا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اسی روش نے ترکی عوام بالخصوص نوجوان نسل کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ اسلام کے عقائد اور اخلاقیات کو نظر انداز کریں۔ ان کی جگہ رفتہ رفتہ غیر اسلامی عقائد یا فلسفہ ہائے زندگی نے لے لی ہے۔ ان میں مارکس ازم، ڈاروِنزم اور مادہ پرستی وغیرہ سرفہرست ہے۔

کچھ یہی حالت میمار سینان یونیورسٹی کی بھی تھی۔ طلبہ ہوں یا اساتذہ، ان کے خیالات پر فلسفہ مادیت اور مارکسزم کے اثرات نمایاں تھے۔ حتیٰ کہ اساتذہ بلاضرورت ڈاروِنزم اور اس جیسے عقائد کا پرچار کرتے نظر آتے تھے خواہ وہ کسی اور موضوع پر بات ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ اس ماحول میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر قدرے مشکل امر تھا۔ مذہبی مباحثوں کو سخت ردعمل کا سامنا تھا۔

اپنی تعلیم کے دوران ہی عدنان اختر نے لوگوں کو اسلامی عقائد اور اللہ کی وحدانیت کی جانب بلانا شروع کیا۔ اس کے لئے مطالعے کو انہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان کی والدہ محترمہ مدیحہ اختر کہتی ہیں کہ ان دنوں عدنان ہر شب صرف چند گھنٹوں تک ہی سوتے تھے۔ وہ ساری ساری رات لکھتے، پڑھتے اور نوٹس جمع کرتے ہوئے گزار دیتے۔ اس دوران انہوں نے مارکسزم، مادہ پرستی اور کمیونزم جیسے دیگر الحادی موضوعات اور ان کے بنیادی فلسفے پر سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ رفتہ رفتہ ان موضوعات پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ان کی معلومات کا

مقابلہ وہ لوگ بھی نہ کر سکتے تھے جو ان "ازموں" کے حامی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے نظریہ ارتقاء کا سائنسی سطح پر گہرا مطالعہ کیا۔ "نظریہ ارتقاء" درست ہے یا غلط اور مکمل ہے یا نامکمل لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی ممالک بالخصوص ترکی میں اسے مذموم الحادی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ان تمام نظریات کی خامیوں اور سقم کو مٹھی میں لے کر عدنان اختر نے لوگوں کو اسلامی عقائد اور توحید کی جانب بلانا شروع کیا۔ اس کے اظہار کے لئے انہوں نے درست سائنسی حقائق کو استعمال کیا۔ نظریہ ارتقاء کو میمار سینان یونیورسٹی کے طالب علموں کے ایمان کو نشانہ بنانے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اکثریت اس نظریئے سے اس لئے متاثر تھی کہ اسے ٹھوس سائنسی حقائق کا لبادہ اوڑھا کر مذہب بیزاری کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ اس نظریئے کو خالق کے تصور کو نکال باہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔

نظریہ ارتقاء پر پہلا کتابچہ

اسی جامعہ میں رہتے ہوئے عدنان اختر نے "نظریہ ارتقاء" نامی پہلا کتابچہ شائع کیا۔ اس کی طباعت اور تقسیم کے تمام اخراجات خود برداشت کئے۔ اس کے لئے جائیداد میں ملنے والی کچھ متاع بیچنی پڑی۔ اس کتابچے کی کاپیاں بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کی گئیں۔ کتابچے میں جذباتی گفتگوں کے بجائے سائنسی اور منطقی انداز اختیار کیا گیا تھا۔ عدنان اختر نے زور دے کر کہا کہ اعلیٰ ترین جاندار اتنے بہت سے حادثات اور اتفاقات کے نتیجے میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان نظریات پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنا درست نہیں۔ اس وقت جامعہ میں یہ حالت تھی کہ کچھ طالب علم کھلے عام کہتے تھے "اگر میں اللہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں تب بھی اس سے جنگ جاری رکھوں گا" (نعوذ باللہ)۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ الحادی نظریات کس سطح پر لوگوں کو متاثر کر چکے تھے۔

پھر عدنان اختر کے ساتھ بھی وہی ہوا جو تمام اہلیان حق کے ساتھ ہوتا رہا۔ اساتذہ اور طالب علموں کے حلقوں سے سخت ردعمل اور دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت مارکسسٹ حلقہ یونیورسٹی پر راج کر رہا تھا۔ جامعہ میں ہر روز درجنوں لوگ قتل ہو رہے تھے۔ ان اعصاب شکن حالات میں بھی عدنان اختر مولیٰ مسجد جاتے اور بلاخوف نماز ادا کرتے۔

تنہائی کے تین سال

جب عدنان اختر نے میمار سیمان یونیورسٹی میں اللہ کا نام لینا شروع کیا تو مخالفت کے علاوہ انہیں شدید اکیلے پن کا سامنا تھا۔ کوئی ہم خیال ایسا نہ ملا جو اس مشن میں دو قدم چلتا۔ نہ ہی کوئی اپنے خیالات بدلنے پر آمادہ ہوا۔ کبھی کبھار لوگ ان کے کہنے پر رک جاتے، یہ دیوانہ اللہ کا نام لیتا، وہ سنتے اور آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ اسی دل گرفتگی کے عالم میں تین سال گزر گئے۔ اس عرصے میں عدنان اختر کو ایک بھی مخلص ہم نوا نہ ملا۔ مارکسزم اور الحاد سے وہ نظریاتی جنگ عدنان اختر نے تنہا ہی لڑی۔ یہ حلقے ان کی مدلل گفتگو اور منطقی نقاط کا جواب دینے سے تو عاجز تھے۔ جواباً وہ انہیں شدید برا بھلا کہتے ہوئے ان کے لباس، داڑھی اور طرز زندگی کا مذاق اڑاتے تھے۔

اور کارواں بنتا گیا......

عدنان اختر ایک ذہین طالب علم رہے۔ وہ فائن آرٹس کی سند لے کر شاندار مستقبل کی جانب بڑھ سکتے تھے۔ وہ عام انسانوں کی طرح یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ پہلے کیریئر پر توجہ دی جائے اور پھر اسلام کی تبلیغ جاری رکھی جائے۔ اپنا وقت، صلاحیت اور توانائی کی ناقدری دیکھ کر وہ یہ کام چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے نہ صرف اسے جاری رکھا بلکہ اور زیادہ محنت سے اس جانب مبذول ہوئے۔ انہوں نے تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے سامنے ترکی کے ایک اور مذہبی اسکالر جناب بدیع الزماں سعید نورسی کے یہ الفاظ تھے " کمال یہ نہیں ہے کہ سننے کے لئے کتنے سامعین جمع ہوتے ہیں اصل میں صرف اللہ کی رضا پیش نظر ہونی چاہیے" اور وہ آگے بڑھتے گئے۔

1982ء میں پہلی مرتبہ چند نوجوانوں نے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جو جامعہ میں نووارد تھے۔ ماہ و سال گزرتے رہے اور وہ عدنان اختر کے ساتھ کام کرتے رہے۔ وہ ان کی رہنمائی کر کے انہیں بہتر انسان بنانا چاہتے تھے۔ اس دوران عدنان اختر نے مارکسی خیالات کی رد اور تخلیق اور اللہ تعالیٰ کے معجزات کے بیان پر زور دیا۔ 1982ء سے 1984ء تک 20 سے 30 طالب علموں کا گروہ قائم ہوگیا۔

1984ء میں استنبول کے نجی اسکولوں میں زیر تعلیم اعلیٰ خاندانوں کے بچے ان کے پاس آئے۔ عدنان اختر نے انہیں اللہ کے پیغام سے آگاہ کیا۔ اسلام کی روحانی اور عظیم اقدار سے متعارف کرایا۔ 1984ء میں ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس مدت میں وہ میمار سینان یونیورسٹی

ے قطع تعلق کر کے استنبول یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لے چکے تھے۔ نوجوان نسل نہ صرف عدنان اختر کے افکار سے متاثر ہوئی بلکہ عدنان اختر کے برتاؤ، اخلاق و کردار نے بھی ان کے ذہنوں پر گہرا نقش ثبت کیا۔ بعد ازاں وہ اپنے دوستوں کو بھی اس محفل میں لاتے رہے اور اس طرح ہم خیال افراد کا حلقہ بڑھتا گیا۔

پہلی مرتبہ ذرائع ابلاغ میں

1986ء میں ترکی کے ایک سنجیدہ جریدے "نکتہ" (Nokta) نے عدنان اختر کی خدمات کو اپنے سرورق پر شائع کیا۔ اس مضمون میں بتایا گیا کہ عدنان اختر کس طرح نوجوان نسل کو اسلام کی جانب راغب کر رہے ہیں۔ بعد ازاں مختلف جامعات کے طالب علم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہونے لگے۔ اسی سال موسم گرما کے ساتھ ہی عدنان اختر تقریباً ہر روز اخبارات کا موضوع بننے لگے۔ کئی اخبارات نے ان کی خدمات اور کام پر شہ سرخیاں لگائیں اور اس شخص کا ذکر ہونے لگا جو اسلام سے دور معاشرے کے افراد میں اللہ کا آفاقی پیغام پہنچانے کی سعی کر رہا ہے۔

صہیونیت اور فری میسنری کے خلاف تصانیف

جناب عدنان اختر نے صہیونی سرگرمیوں اور فری میسنری تنظیم کے مقاصد کو بے نقاب کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ترکی میں ان تنظیموں کے عمل دخل کے متعلق جاننا بہت ضروری ہے۔ فری میسنری اور صہیونی آلہ کار ایک عرصے سے ترکی میں بے حد سرگرم رہے ہیں۔ ان کی کاروائیوں کے لئے ترکی کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ رفتہ رفتہ یہ عناصر ذرائع ابلاغ، تعلیمی اداروں، غیر سرکاری تنظیموں حتیٰ کہ سرکاری مشینری تک میں سرایت کر چکے ہیں۔
ان کا مطمع نظر ترکی عوام کو دین سے دور کر کے ان کی جگہ لادین عقائد و نظریات کو فروغ دینا ہے۔ لوگوں کو اسلام کے آفاقی عقائد سے دور کر کے ان لغو اور باطل عقائد کی لاٹھی سے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جائے۔ ترکی میں ہر اہم سطح پر رہتے ہوئے یہ عناصر پوری شدت سے سرگرم تھے اور اب بھی ہیں۔

ان کی رد میں عدنان اختر نے طویل مطالعہ کیا اور فری میسر کی عناصر کے تمام لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ طویل تحقیق کے بعد انہوں نے "یہودیت اور فری میسنری" پر اپنی زبردست کتاب لکھی۔ اس تصنیف کے ذریعے پہلی مرتبہ فری میسن کے مقاصد عوام کے سامنے ظاہر کئے گئے۔

کتاب میں فری میسن اور یہودی افراد کی مکمل فہرست دی گئی تھی اور یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ وہ حکومت، اداروں، درس گاہوں اور میڈیا میں کن کن عہدوں پر اور کہاں کہاں موجود ہیں۔ ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانے کے لئے عدنان اختر نے فری میسن تصانیف کا ہی حوالہ دیا تھا۔ اس کتاب نے کئی تاریک گوشے بے نقاب کئے اور ان تمام مقاصد کو یہودی نسل پرستی (Zionism) سے منسلک کیا گیا۔ ان تنظیموں کے طریقہ کار مقاصد اور کام کرنے کے فلسفے کو بھی بیان کیا گیا تھا۔

فری میسن کی جانب سے دشمن اقدامات

فری میسن پر مضامین سے یہ حلقے بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے ہر طرح عدنان اختر کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے لالچ دیا گیا عدنان اختر سے کہا گیا کہ اگر وہ فری میسن کے خلاف قلم روک دیں تو انہیں خطیر رقم دی جائے گی۔ عدنان اختر نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر دوسرا اور سخت حربہ آزمایا گیا۔ ان کے خلاف ایسا مقدمہ بنوایا گیا جس کے جرم کا ارتکاب انہوں نے کیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے انٹرویوں میں کہا تھا "میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور ترکی نسل سے تعلق رکھتا ہوں"۔ اس کے بعد ان کے خلاف شرم انگیز پراپیگنڈا شروع کر دیا گیا۔ فری میسن کے ہرکاروں نے عدنان اختر کو اصل خطرہ گردانتے ہوئے گرفتار کروادیا۔

دماغی مریضوں کے درمیان قید

جب پہلی مرتبہ عدنان اختر کو قید کیا گیا تو انہیں بیکر کوئے نامی دماغی ہسپتال میں رکھا گیا۔ انہیں یہ کہہ کر نگہداشت میں رکھا گیا کہ ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ محض ایک بیان تھا جب کہ پس پردہ مقاصد کچھ اور تھے۔ انہیں 14A نامی وارڈ میں رکھا گیا جہاں خطرناک ذہنی مریض موجود تھے۔ ان مریضوں کو مار پیٹ سے درست رکھا جاتا تھا اور ان مریضوں کے لئے قتل کرنا بھی معمولی بات تھی۔ یہاں عدنان اختر کو زنجیروں میں باندھ کر بستر پر رکھا گیا۔ اس دوران ذہنی توازن تباہ کرنے والی ادویہ زبردستی دی گئیں۔ تاہم عدنان اختر کے قریبی رفقاء رازداری سے انہیں دیکھنے آتے رہے۔ وہ گواہ ہیں کہ ان مصائب میں بھی عدنان اختر کے حوصلے بلند تھے۔ 19 ماہ کی طویل اذیت کے بعد عدنان اختر کا مقدمہ جھوٹا ثابت ہونے پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس دوران وہ سلاخوں کے پیچھے صرف 5 تا 10 منٹ تک اپنے رفقاء کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ لوگوں سے بار بار کہتے:

"فکر نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے"

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر اس حالت میں کسی اور شخص کو رکھا گیا ہوتا تو وہ کب کا پاگل ہو چکا ہوتا۔

نئے حلقے بننے لگے

1988ء میں قید نے ان کی عزت اور شہرت کو مزید نمایاں کر دیا۔ اس وقت بھی ان کے رفقاء جامعہ میں موجود تھے۔ تاہم اسلام اور فلسفہ حیات کا ابدی پیغام اب جامعات سے نکل کر اسکولوں اور معاشرے کے کئی حلقوں میں نفوذ کر رہا تھا۔ لوگ اسلام کے ضابطہ حیات اور آفاقی قدروں کی قدر کرنے لگے تھے۔

سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن کا قیام

اپنی رہائی کے فوراً بعد وہ ایسی تنظیم کی نظریاتی بنیادوں پر غور کرنے لگے جس کے تحت اسلام کو جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اسی طرح سائنسی بنیادوں پر دین حق کی تبلیغ کا بیڑہ اٹھایا گیا۔

یہ کوششیں اس وقت بار آور ہوئیں جب جنوری **1990**ء میں عدنان اختر اور نوجوان ساتھیوں نے سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن قائم کر دی۔ اغراض و مقاصد کے تمام پہلوؤں پر کام کیا۔ آج یہ ایک مستحکم ادارہ بن چکا ہے۔ اس کے ذمے اسلام، سائنس، ڈارونزم اور دیگر موضوعات پر ویب سائٹ کی تیاری کا کام ہے۔ **11** ستمبر **2001**ء کے بعد اسی ادارے نے امریکہ اور یورپ کے بڑے شہروں میں کئی کانفرنسیں اور مذاکرے منعقد کئے۔ ان سب کا موضوع تھا "اسلام دہشت گردی کی مذمت کرتا ہے"۔ اپنے نام سے عیاں ہے کہ یہ کانفرنسیں مغرب میں اسلام کی درست تصویر پیش کرنے کے لئے منعقد کی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ ادارہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام بھی کر رہا ہے۔ عدنان اختر تا حال اس فاؤنڈیشن کے اعزازی صدر ہیں۔

ابھی فاؤنڈیشن کے قیام کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ اس کے باقاعدہ اجلاس پر پولیس نے دھاوا بول دیا۔ **100** سے زائد افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ اگلے ہی روز یہودی میڈیا نے شور مچایا کہ مجرموں کا ایک بڑا گروہ گرفتار کر لیا گیا۔ اگرچہ اکثر اراکین کو صرف تین چار گھنٹے بعد ہی رہا کر دیا گیا تھا مگر ذرائع ابلاغ کا منفی پروپیگنڈا کئی دنوں تک جاری رہا۔ پولیس نے ایک ہفتہ

تک عدنان اختر کو حراست میں رکھ کر ان سے "تفتیش" جاری رکھی۔ مگر بفضل تعالیٰ انہیں باعزت طور پر رہا کر دیا گیا۔

کوکین پیکٹ کا ڈرامہ

1990ء کے وسط میں سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن کی سرگرمیاں زبردست عروج پر تھیں۔ 1991ء کے وسط میں فاؤنڈیشن کے دو جواں سال اراکین رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ان دونوں افراد کے اہل خانہ اس شادی سے ناخوش تھے۔ اس واقعے کا ذمہ دار بھی عدنان اختر ہی ٹھہرایا گیا۔ وہ دوبارہ گرفتار ہوئے۔ مگر اس بار شکاریوں کے پاس نیا جال تھا۔ "اورتا کووے" کے جس مکان میں عدنان اختر اپنی والدہ کے ساتھ مقیم تھے، پولیس افسران نے اس کا دروازہ توڑ کر عدنان اختر کے کتب خانے سے کوکین کا پیکٹ برآمد کر لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ دیواروں پر محیط ہزاروں کتابوں کے درمیان چھپایا گیا کوکین پیکٹ صرف چند منٹوں میں برآمد کر لیا گیا۔

اس کے فوراً بعد عدنان اختر کو چند دوستوں کے ہمراہ گرفتار کیا گیا۔ پھر انہیں استنبول کے سکیورٹی ہیڈ کوارٹرز میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہیں 62 گھنٹے تک تفتیش کے لئے زیر حراست رکھا گیا۔ 62 گھنٹوں کے بعد انہیں تفتیشی (فورینسک) ادویہ کے مرکز میں بھیجا گیا۔ یہاں بھی ایک دلچسپ کہانی ہوئی۔ خون میں کوکین کی بائی پروڈکٹ کی زبردست مقدار نوٹ کی گئی۔

اس سازش سے کچھ ہی پہلے ان کی والدہ مدیحہ اختر نے چند پڑوسیوں کی مدد سے پورے مکان کی جھاڑ پونچھ کی تھی۔ باری باری ہر کتاب کو صاف کر کے خانوں میں جمایا گیا تھا۔ صفائی کے بعد عدنان اختر گھر بھی نہیں گئے تھے۔ مگر 16 پولیس اہلکاروں نے زبردستی گھر میں گھس کر چند لمحوں میں کوکین پیکٹ برآمد کر لیا۔ بعد ازاں چوکیدار اور پڑوسیوں نے بھی عدالت میں یہی بیان دیا کہ ہم نے تمام کمروں اور کتابوں کی صفائی کی تھی وہاں کوکین نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔

اس کہانی کا دوسرا رخ عدنان اختر کے جسم میں کوکین کے اجزاء کی موجودگی ہے۔ سائنسی اور قانونی رو سے ان الزامات کی کوئی حیثیت نہیں۔ چونکہ وہ سکیورٹی ہیڈ کوارٹرز میں 62 گھنٹے تک قید رہے تھے۔ اس کے بعد ان کے خون کا نمونہ لیا گیا تھا۔ طبی نقطہ نگاہ سے خون میں منشیات (بالخصوص کوکین) کی مقدار دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خوراک کتنے گھنٹے پہلے لی گئی ہے۔ اگرچہ عدنان اختر گرفتار ہوئے 62 گھنٹوں سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا مگر اس وقت بھی خون میں کوکین کی مقدار ہلاکت خیز سطح تک بلند دیکھی گئی۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ یہ کوکین زیر حراست دی

گئی تھی۔ کوکین انہیں کھانے میں ملا کر دی گئی۔

اس بات کی تصدیق 30 کے قریب بین الاقوامی اداروں نے بھی کی جن میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کا ادارہ بھی شامل تھا۔ ان تمام اداروں کی رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے " کوکین انہیں اس وقت کھانے میں ملا کر دی گئی تھی جب وہ سیکیورٹی ہیڈ کوارٹرز میں زیر حراست تھے۔ یہ سب ایک شرمناک سازش کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"۔ ساتھ ہی ترکی کے کئی اداروں نے بھی اس امر کی تصدیق کردی کہ یہ منشیات انہیں کھانے میں ملا کر پیش کی گئی تھی۔

اس سازش سے ایک قلعی تو یہ کھلی کہ عدنان اختر اور ان کے مشن کے دشمن ظاہر ہو گئے۔ وہ اب ہر طرح سے انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس تکلیف دہ سازش سے چند دنوں قبل انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ترکی میں فری میسنری کی سرگرمیوں پر تحقیقی کتاب شائع کرنے والے ہیں۔ اس اعلان سے صہیونی حلقوں میں بھونچال آ گیا اور انہوں نے یہ شر انگیز ڈرامہ رچایا۔

ذرائع ابلاغ مین اس واقعے کی تشہیر؟

" کوکین ڈرامے " کی غایت عدنان اختر کو نشے کا عادی ثابت کر کے عوام الناس میں ان کی تذلیل تھا۔ ترکی میں یہودی نواز اخبارات نے ان کے خلاف بڑی بڑی شہ سرخیاں لگائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ملحد اور مادہ پرست معاشرے میں اللہ کا پیغام اور فلسفہ اسلام کی تشہیر نہ ہو سکے (نعوذ باللہ)۔ وہ اخبارات جنہوں نے عدنان اختر پر جھوٹے الزامات کی آٹھ آٹھ کالمی خبریں شائع کی تھیں۔ انہوں نے بے گناہ ثابت ہونے پر چند سطریں بھی شائع نہیں کیں۔ اس رویے پر عدنان اختر خاموش رہے اور صبر کیا۔

گوشہ نشینی

اس واقعے نے عدنان اختر کو مزید حساس بنا دیا۔ وہ زیادہ شدت سے سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن میں منہمک ہو گئے۔ 1991ء کے بعد سے انہوں نے تمام توانائیاں فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں اور تصانیف کی نذر کر دیں۔ اب یہ حال ہے کہ وہ زیادہ وقت اپنے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ مذاکروں اور ملاقاتوں کا سلسلہ بہت کم کر دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اصرار کے باوجود وہ اخبارات اور ٹی وی کو انٹرویو دینے سے انکار کرتے ہیں۔

اس عرصے میں وہ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن کے لئے صرف مشوروں اور بنیادی اصول وضع

کرنے تک ہی محدود رہے۔ قرآن اور اسلامی تعلیمات کے ذریعے دیگر اراکین کی کردار سازی پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔ یہ سلسلہ بھی 12 نومبر 1999ء کو ختم ہو گیا جب ایک بار پھر پولیس نے فاؤنڈیشن کے اراکین کو گرفتار کر لیا۔

ممتاز لوگوں کو دعوت تبلیغ

ترکی میں مذہب کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ یہ صرف عمر رسیدہ افراد اور معاشرے کے چند طبقوں کے لئے ہی ضروری ہے (نعوذ باللہ)۔ عدنان اختر عوام الناس کی یہی سوچ بدلنے کے لئے بے قرار تھے اور اب بھی سعی کر رہے ہیں۔ یہی طرز فکر معاشرے میں اسلام کی تبلیغ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس معاشرے میں دھوکہ، ہم جنس پرستی، منشیات کے استعمال اور نوجوانوں میں ہر روز اخلاقی زوال پیدا ہو رہا ہے۔ عدنان اختر قوم کے اس سرمائے کو بچانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے فاؤنڈیشن نے ماڈلوں، گلوکاروں اور اداکاروں کو قرآن کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اس کے لئے ادارے کے اراکین نے ان سے دوستی کی۔ قرآن اور اسلام کے معجزات اور فلسفہ اسلام پر کتب اور آڈیو ویڈیو پیش کی گئیں۔ اللہ کے فضل سے یہ کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں۔

ایک مثال گیولے پینار باسی کی ہے۔ پہلے وہ ترکی کی نامور ماڈل تھیں۔ ایس آر ایف سے تعارف کے بعد اس نے اپنی تمام سرگرمیوں کو خیر باد کہا۔ اب وہ زیادہ وقت اسلام، اخلاق اور علوم جدیدہ کی کتب بینی کرتی ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے اخبارات کے لئے کالم لکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ یوں یہ مشہور ماڈل اب بالکل بدل چکی ہے۔

ڈاروِنزم کے خلاف جدوجہد

1998ء کے اوائل میں عدنان اختر نے اپنے رفقاء کے ہمراہ ڈاروِنزم کی رد میں ایک علمی مہم شروع کی۔ ارتقاء کے ارتداد اور تخلیق پر ہزاروں کتابچے تقسیم کئے گئے۔ سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن نے بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد کیا جن میں دنیا بھر، بشمول امریکہ کے ممتاز ماہرین شریک ہوئے۔ اس سلسلے کی پہلی تین کانفرنسیں استنبول میں منعقد کی گئیں۔ اب تک ترکی کے 120 سے زائد شہروں میں یہ کانفرنسیں منعقد کی جا چکی ہیں۔

اس طرح عوام الناس میں گہرا شعور پیدا ہوا۔ وہ جان گئے کہ نظریہ ارتقاء کو غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اسی سے الحاد اور مادہ پرستی کی تاریک راہیں نکالی گئی ہیں۔ اسی ہتھیار سے ایمان پر کاری ضرب لگائی جاتی رہی ہے۔ پھر تعلیمی نظام میں جا بجا حوالوں سے نظریہ

ارتقاء بیان کیا جاتا ہے۔ عدنان اختر کے نزدیک یہ نظریہ مارکسزم، مادہ پرستی اور الحاد کے فروغ میں استعمال کیا گیا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کانفرنسوں، کتابوں، آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں اور سی ڈیز میں نظریہ ارتقاء پر سائنسی انداز میں ہی ضرب لگائی گئی ہے۔ یہ تمام کام سائنس ریسرچ فاؤنڈیشن ہی کے رہین منت ہے جس کی بنیاد عدنان اختر نے رکھی ہے۔

سائنس ریسرچ فائنڈیشن اب تک سو سے زائد کتب، درجنوں دستاویزی فلمیں اور آڈیو ویڈیو ٹیپس اور سی ڈیز کے علاوہ علمی، سائنسی، سیاسی اور عالمی موضوعات پر نصف درجن ویب سائٹس تیار کر چکا ہے۔ ان تمام چیزوں کی تیاری میں درستگی اور اعلیٰ ترین معیار کا خیال رکھا گیا ہے۔

مزید مخالفت

ان سرگرمیوں سے فری میسنری کے حواریوں میں ہلچل مچ گئی۔ سائنسی اور مدلل انداز میں جواب دینے کے بجائے انہوں نے ان کانفرنسوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ 1999 میں عدنان اختر نے "عالمی فری میسنری" کے نام سے تین جلدی معرکتہ آلآرا تصانیف پیش کر دی۔ اب الحاد کے حلقوں کی پریشانی اور بڑھی، انتقام کی آگ مزید دہکی جو 12 نومبر 1999 کے واقعے پر آٹھہری جب ایس آر ایف کے خلاف ترکی میں سب سے بڑا پولیس آپریشن شروع ہوا۔ اس آپریشن کے پس پردہ وہی پرانے دشمن تھے۔ الزامات وہی بے بنیاد اور تکالیف بھی جانی پہچانی تھیں۔ اس بار بھی ذرائع ابلاغ نے خوب زہر اگلا اور اللہ نے عدنان اختر اور ان کے ساتھیوں کو اس بار بھی سرخرو کیا۔ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اب تک عدنان اختر 170 سے زائد کتب پیش کر چکے ہیں۔ ان کتابوں کا 20 سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آڈیو، ویڈیو اور ویب سائٹ کی تعداد بھی قابل قدر ہے۔ طوفان بلاخیز میں عشق کا قافلہ آج بھی جاری ہے۔ جناب عدنان اختر اب حق گوئی کے حوالے سے دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ (بشکریہ گلوبل سائنس)

محبت اور شوق و رضا کا بیان

(امام ابو حامد الغزالی)

معرفت الٰہی کے پوشیدہ رہنے کے سبب کا بیان

یاد رکھو کہ جن چیزوں کے جاننے سے آدمی معذور ہوتا ہے اس کی دو وجوہ ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ وہ چیز پوشیدہ ہو ظاہر نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ چیز اس قدر روشن ہو کہ آنکھ اس کو نہ دیکھ سکے۔ چمگادڑ اسی لئے رات کو ہی دیکھتا ہے دن کو نہیں دیکھ سکتا۔اس کی یہ وجہ نہیں کہ رات کو چیزیں زیادہ ظاہر ہوتی ہیں بلکہ چیزیں تو دن کو ہی ظاہر اور روشن ہوتی ہیں مگر اس کی بینائی ضعیف ہے اس لئے وہ دن کی روشنی کی تاب نہیں لاسکتی اسی طرح وحی کے کمال اور اس کے حصول کے لئے دلوں کی قوت کے کم ہونے کے باعث خدا کی معرفت دشوار ہوتی ہے۔خدا تعالیٰ کے نور کی مثال ایسی ہے کہ جیسے جب تو ایک لکھا ہوا خط یا سلی ہوئی پوشاک دیکھتا ہے تو کاتب اور درزی کی قدرت، علم، حیات اور ارادے کو اپنے سامنے ظاہر و روشن پاتا ہے کہ ان کا یہ فعل ان کی صفات کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح اگر حق تعالیٰ تمام جہان میں صرف ایک پرندے کو یا نباتات میں سے کوئی ایک چیز ہی پیدا کر دیتا تو دیکھنے والے پر صانع کے کمال علم کمال قدرت، کمال عظمت، اور کمال جلال کی معرفت ضرور بالضرور حاصل ہوتی کیونکہ صانع پر مصنوع کی دلالت، کاتب پر خط کی دلالت سے زیادہ واضح ہے۔مگر آسمان و زمین، حیوانات، نباتات، سنگ اور کلوخ اور جو کچھ موجودہ مخلوق وہم و خیال میں آتے ہیں سب یک زبان ہو کر صانع کی بزرگی پر گواہی دیتے ہیں۔

هر گیاهی که از زمیں روید وحده لاشریک له گوید

دلائل کی کثرت اور روشنی کی شدت کی وجہ سے معرفت پوشیدہ ہے اس لئے کہ اگر کوئی فعل کسی صانع کا ہوتا اور کوئی کسی دوسرے صانع کا تو معرفت بھی ظاہر ہو جاتی لیکن اب چونکہ صانع ایک ہے اور مصنوعات ایک صفت پر ہو گئیں۔لہٰذا صانع کی معرفت پوشیدہ ہو گئی۔اس کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ روشن نہیں کیونکہ تمام چیزیں اسی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔لیکن آفتاب اگر رات کو غروب نہ ہو جاتا یا دن کو سایہ کی وجہ سے چھپ نہ جایا کرتا تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ روئے زمین پر ایک ہی نور ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سفیدی، سیاہی اور رنگوں کے علاوہ کچھ بھی نہ دیکھ پاتے۔لہٰذا یہی کہتے کہ ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔پس ان کا اس چیز پر آگاہ ہو جانا کہ نور کا وجود رنگوں سے یکسر علیحدہ چیز ہے اسی بنا پر تھا کہ رات کو رنگ پوشیدہ ہو جاتے ہیں بلکہ

سو یہ بھی اس قدر مبہم اور غیر واضح ہو جاتا ہے کہ نور آفتاب کی موجودگی میں پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا۔ پس آفتاب کو جو پہچانا تو اس کی ضد سے پہچانا۔ اب اگر اسی طرح خالق کا کبھی موجود اور کبھی معدوم ہونا ممکن ہوتا تو آسمان اور زمین تو خیر تباہ و برباد اور نیست و نابود ہو ہی جاتے لیکن البتہ مخلوق کو خالق کی پہچان ہو جاتی۔ مگر چونکہ تمام موجودات و مخلوقات اپنے خالق پر بیک زبان گواہ ہیں اور یہ گواہی بھی ہمیشہ کے لئے ہے تو گویا روشنی ہی روشنی ہے کہ معرفت الٰہی اس میں پوشیدہ ہو گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی مصنوعات و مخلوقات ہم بچپن سے ہی دیکھتے چلے آتے ہیں جبکہ بچپن میں ان باتوں کا شعور تک نہیں ہوتا کہ یہ صفتیں کس صانع کی گواہی دے رہی ہیں۔ پھر ان کے خوگر ہوتے ہوتے ان سے مانوس تو ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی محبت میں گرفتار بھی ہو جاتے ہیں لیکن نہ ان سے صانع کی گواہی طلب کرتے ہیں اور نہ ان سے آگاہ ہو پاتے ہیں۔ البتہ بھی کبھار کوئی عجیب الخلقت جانور یا کوئی نئی نباتات دیکھ کر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ گویا اس کی گواہی پہلے سے دل میں موجود تھی۔ پس اگر بینائی کمزور نہ ہو تو دیکھنے والے کو ہر چیز میں صانع ہی نظر آئے گا نہ کہ وہ صفت۔ وہ زمین و آسمان کو بھی صرف اس لئے دیکھتا ہے کہ وہ صانع کی صنعت پر گواہ ہیں۔ جس طرح کوئی شخص خط کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ سیاہی اور کاغذ ہے کیونکہ اس طرح وہی شخص دیکھتا ہے جو خط سے ناواقف ہو بلکہ اس نظر سے دیکھے کہ یہ خط آراستہ ہے حتیٰ کہ اس میں کاتب کو دیکھنے لگتا ہے جس طرح کسی تصنیف میں مصنف کی شخصیت کو موجود پاتے ہیں اور کتاب میں خط کو نہیں دیکھتا بلکہ صاحب کتاب کو دیکھتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر جس چیز میں نظر کرتا ہے خدا کو ہی دیکھتا ہے۔ اس لئے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی بنائی ہوئی نہ ہو بلکہ سارا جہاں اسی کی صفت اور کتاب ہے۔ عزیزم! اگر تو ایسی چیز دیکھنا چاہے جو نہ اس کی مصنوع ہو اور نہ اس کی ذات ہو تو ہرگز نہ دیکھ سکے گا اور سب مخلوق زبان فصیح یعنی زبان حال سے اس کے کامل قدرت اور کمال جلال و عظمت پر گواہی دیتی ہے۔ جہان میں اس سے روشن کوئی نہیں مگر مخلوق اپنے ضعف کی وجہ سے اس معرفت سے عاجز رہتی ہے۔

محبت پیدا کرنے کی تدبیر کا بیان

جان لو کہ محبت تمام مقامات میں سے بزرگ ترین مقام ہے۔ لہٰذا اس کی تدبیر کا جاننا ضروری ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ خوبرو پر عاشق ہو تو سب سے پہلے وہ باقی تمام چیزوں سے منہ موڑ لیتا ہے اور ہمیشہ اسی کو دیکھتا رہتا ہے پھر یہی نہیں کہ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے بلکہ اس

کے دوسرے اعضاء کو بھی دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ بھی اس حسن کا حصہ ہوتے ہیں۔ جب اس نظارہ بازی پر مداومت کرے گا تو خواہ مخواہ اس کی دل میں تھوڑی بہت رغبت پیدا ہو جائے گی۔ پس محبت الٰہی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی دنیا کی طرف سے منہ موڑے اور اس نابکار کی محبت سے دل کو پاک کرلے کہ غیر خدا کی محبت آدمی کو خدا کی محبت سے روکتی ہے۔ یہ دل کو پاک کرنا ایسا ہے جیسے کوڑے کرکٹ سے زمین کو پاک کرنا۔ یہ ہو چکے تو پھر اس کی معرفت کا طالب ہونا چاہیے۔ جو شخص حق تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی حقیقت سے ناواقف ہے ورنہ جمال وکمال تو آدمی کو فطری طور پر محبوب ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو پہچان لے وہ ان کو لامحالہ دوست رکھے گا اس لئے کہ اوصاف حمیدہ بالطبع محبوب ہیں اور معرفت حاصل کرنا ایسا ہے جیسے تخم ریزی کرنا پھر ذکر وفکر میں مشغول ہونا گویا اس کی آبیاری کرنا ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوست کو یاد کرتا ہے تو خواہ مخواہ اس کے دل میں انس پیدا ہو جاتا ہے۔ عزیزم جان لو کہ کوئی بھی مسلمان اصل محبت سے خالی نہیں البتہ باہمی فرق تین وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ دنیاوی محبت میں ہر شخص کا درجہ مختلف ہوتا ہے اور ایک شے کی محبت دوسری شے کی محبت پر اثر انداز ہوتی ہے یعنی اسے کم کردیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ معرفت میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی امام شافعیؒ کو صرف اس لئے دوست رکھتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ عالم ہیں مگر جو فقیہہ ان کے علم وفضل سے واقف ہے وہ اس عام آدمی کے مقابلہ میں ان سے زیادہ محبت کرے گا۔ کیونکہ عام آدمی کی بہ نسبت وہ انہیں زیادہ جانتا ہے چنانچہ ان کے حالات، علوم اور اخلاق سے زیادہ واقف ہونے کے سبب ان کے شاگرد مزنی انہیں دوست بھی بہت زیادہ رکھتے تھے۔ اسی طرح جو شخص حق تعالیٰ کو جس قدر زیادہ جانتا ہے اسی قدر وہ اسے دوست بھی زیادہ رکھتا ہے۔

تیسرے یہ کہ کسی کے ذکر وفکر اور فرمانبرداری میں فرق ہوتا ہے اور انس ومحبت کی بنیاد یہی ہوتی ہے اور جب اسی ذکر وفکر میں فرق ہوگا تو یقیناً شوق وانس میں بھی فرق ہوگا پس کسی شخص کا حق تعالیٰ سے محبت کرنا صرف اسی لئے ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی خبر نہیں ہوتی ورنہ حسن وجمال تو جس طرح ظاہر میں پسندیدہ ہوتا ہے ویسے ہی باطنی جمال وحسن بھی مرغوب ومحبوب ہوتا ہے۔ پس محبت نتیجہ ہے معرفت کا اور حصول معرفت دو طرح ہوسکتا ہے۔ پہلا تو وہ طریقہ جو صوفیاء کا ہے کہ مجاہدہ وریاضت اختیار کرنا اور ذکر دوام سے باطن کی صفائی کرنا تاکہ غیر اللہ سے بالکل چھٹکارا حاصل ہو جائے تب ان کے باطن میں وہ معاملات ظاہر ہوتے ہیں جن سے عظمت الٰہی مشاہدہ

کی طرح روشن ہو جاتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے جال بچھانا کہ ہوسکتا ہے کہ شکار اس میں
پھنس جائے یا نہ پھنسے اور پھر ممکن ہے کہ چوہا آ پھنسے یا باز گرفتار ہو جائے گویا اپنا اپنا نصیب ہوتا
ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر کسی کا نصیبہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ علم معرفت
حاصل کیا جائے، علم کلام اور دوسرے علوم کا حاصل کرنا اتنا ضروری نہیں اور علم معرفت کی ابتدا
یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتوں اور عجائب وغرائب میں غور وفکر کیا جائے چنانچہ ساتویں اصل میں
اس کا بیان ہو چکا ہے۔ پھر ترقی کر کے جمال وجلال الٰہی میں تفکر کی منزل آتی ہے اور اسماء الٰہی
کے اسرار اس پر منکشف ہوتے ہیں اور یہ ایک بہت عظمت والا علم ہے جس کی تفصیل طویل ہے
لیکن عقلمند اور ہوشیار مرید اپنے مرشد کامل کے ذریعہ اسے حاصل کر لیتا ہے لیکن کند ذہن اس مرتبہ
کو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس میں جال لگانے اور دام بچھانے والی بات تو ہوتی نہیں کیونکہ یہ
تجارت، زراعت اور کسب معاش کے لئے کسی پیشہ کی طرح ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے
بکری کے نر اور مادے کا جوڑا پالا تو نسل خواہ مخواہ بڑھے گی، مال زیادہ ہوگا۔ لیکن اگر ان پر بجلی
گرے اور وہ اچانک تباہ ہو جائیں تو مجبوری ہے اور اگر کوئی معرفت کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور
طریق سے حصول محبت کا متلاشی ہے تو وہ طلب محال میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے اور جو
کوئی حصول معرفت کے لئے مذکورہ دو طریقوں کے علاوہ کسی اور طریق کا متلاشی ہے اسے بھی
کامیابی نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آخرت کی سعادت کا حصول محبت الٰہی کے بغیر بھی
ممکن ہے تو سخت غلطی پر ہے کیونکہ آخرت کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حق تعالیٰ تک رسائی
حاصل ہو جائے۔ اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر رسائی کسی ایسی چیز تک ہو جائے جس سے
پہلے بھی محبت رہی ہو لیکن عوائق کی وجہ سے وقتی طور پر آنکھوں سے اوجھل تھی جب کہ محبوب ہونے
سے پہلے ایک عرصہ اس کے اشتیاق میں گزر چکا ہو تو پردوں کے ہٹتے ہی پھر پہلے والا شوق اور
ولولہ از سر نو تازہ ہو جائے گا اسی کا نام سعادت ہے لیکن اگر پہلے سے محبت موجود ہی نہ ہو تو اسے
کچھ بھی لذت نہیں ملتی اور اگر کچھ معمولی سی محبت اس سے پہلے رہ چکی ہو تو معمولی سی لذت بھی مل
جاتی ہے۔ پس سعادت کی مقدار وہی ہوگی جو عشق ومحبت کی ہوگی اور اگر نعوذ باللہ کسی نے اپنے
باطن میں کسی ایسی چیز کا نقشہ الفت اور مناسبت پیدا کر رکھی ہو جو محبت الٰہی کے مخالف ہو تو آخرت
میں اس کا انجام اہل سعادت کے برعکس ہوگا اور وہ اس کی ہلاکت، رنج اور مصیبت کی صورت میں
ظاہر ہوگا۔ جو چیز دوسروں کے لئے سعادت کا باعث بنے گی وہی اس کے لئے ہلاکت کا سبب
بن جائے گی۔ لوگ سعید کہلائیں گے اور یہ بد بخت شقی کہلائے گا۔

حکایت :-ایک خاکروب عطر سازوں کے بازار میں گیا اور وہاں کی خوشبوئیں سونگھ کر بے ہوش ہوگیا اور گر پڑا۔ لوگ آ کر اس پر گلاب چھڑکنے لگے اور اسے مشک سنگھانے لگے لیکن اس کا حال مزید بدتر ہوتا گیا حتیٰ کہ ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا جو کسی زمانہ میں خود خاکروب رہ چکا تھا۔ اس نے اس کا حال پہچانا اور گندگی و غلاظت اٹھا کر بھگوئی اور اس کے ناک پر مل دی۔ وہ فوراً ہوش میں آ گیا اور کہنے لگا" خوشبو تو یہ ہے"۔ پس جس نے لذت دنیا کے ساتھ انس پیدا کیا اس کی مثال اسی خاکروب کی مانند ہے۔ جس طرح عطاروں کے بازار میں گندگی اور غلاظت کا گزر نہیں ہوتا بلکہ ان کی دوکانوں پر جو کچھ ہے وہ نجاست و بدبو کی عین ضد ہے اور خود خاکروب کی طبیعت کے بھی بالکل خلاف ہے اور اس کے لئے باعث تکلیف ثابت ہوتا ہے اور جس چیز کے ساتھ اس نے الفت پیدا کی وہ وہاں موجود نہ تھی۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں بھی دنیا کی شہوتوں میں کوئی چیز نہ ملے گی اور جو نعمتیں وہاں ہونگی وہ اس کی طبیعت کے خلاف ہونگی۔ پس وہی چیزیں اس کے لئے رنج و مصیبت اور اس کی شقاوت کا باعث ہونگی۔ آخرت عالم ارواح اور جمال الٰہی ہے کیونکہ جمال الٰہی وہاں ظاہر ہوگا۔ سعید وہ شخص ہے جس نے دنیا میں اس کے ساتھ مناسبت پیدا کی حتیٰ کہ وہ اس کے موافق ہو جائے اور سب ریاضتیں، عبادتیں اور معرفتیں اسی مناسبت کے لئے ہیں اور محبت خود یہی مناسبت ہے جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **"قد افلح من تزکی"** اس کے یہی معنی ہیں اور دنیا کی سب معصیتیں محبتیں اور شہوتیں اس مناسبت کی ضد ہیں۔ آیت کریمہ **"وقد خاب من دسها"** سے یہی مراد ہے۔

ارباب بصیرت نے اس مضمون کو حد تقلید سے گزر کر صدق پیغمبر سے پہچانا ہے بلکہ اس کی وجہ سے صدق پیغمبر کو بغیر کسی معجزہ کے یقینی سمجھے ہیں۔ اس لئے کہ جو شخص علم طب جانتا ہے وہ اگر کسی طبیب کی بات سنتا ہے، پہچان جاتا ہے کہ یہ طبیب ہے اور جب وہ دکاندار حکیم کی بات سنتا ہے تو جان جاتا ہے کہ یہ جاہل ہے۔ پس اسی طرح سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان ہو جاتی ہے پھر جو کوئی اپنی بصیرت کے زور سے پہچانتا ہے اصل میں اس کا بیشتر حصہ نبی کی وجہ سے پہچانا ہوتا ہے اور یہی علم یقینی ہوتا ہے کہ یہ ایسے تو حاصل نہیں ہوا ہوتا جیسے اپنے سامنے لازمی عصا کو اژدہا بنتے دیکھ کر حاصل ہوا ہو۔ کیونکہ اس قسم کا علم تو ہر وقت خطرے سے دور رہتا ہے کہ گوسالے کی آواز سے باطل ہو جائے۔ کیونکہ پیغمبر کے معجزہ اور سامری کے جادو میں امتیاز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ علم ضروری و یقینی آسان اور آسان فہم ہوتا ہے۔

نسلی تعصب کا دور کرنا

(صدرالدین)

نسلی تعصب دنیا کا امن تباہ کرنے کا موجب ہے۔ سرور کائنات فخر موجودات ﷺ کو اس کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے اقوام عالم کو نسلی تعصبات دور کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ کیونکہ جب تک اس خطرناک مرض کا تدارک نہ کیا جائے۔ امن و آرام کی زندگی کا حصول ممکن نہیں۔ ہندو کو یقین ہے کہ برھما صرف ہماری قوم کا خدا ہے۔ اور ہم اس کی چہیتی قوم ہیں۔ ہمارے وطن سے باہر جس قدر اقوام عالم ہیں۔ وہ سب کی سب ناپاک ہیں۔ ان کو چھو جانے سے ہم اور ہماری اشیاء خورد و نوش ناپاک ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہندو غیر ہندو سے شدید نفرت کرتا ہے غیر ہندو کے برتن کس قدر بھی صاف ستھرے کیوں نہ ہوں ہندو ان کو ناپاک ہی یقین کرتا ہے۔ اور بھولے سے بھی غیر ہندو کے برتن کو استعمال نہیں کرتا۔ ہندوستان سے باہر بسنے والے غیر ملک کے رہنے والوں سے ہی ہندو نفرت نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے وطن کے دس کروڑ اچھوتوں کو بھی شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان اچھوت اقوام میں سے کئی ایک ذہین نوجوان یورپ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم و تہذیب سے بہرہ ور ہو کر ہندوستان میں واپس آئے ہیں۔ پھر بھی ان کو ناپاک سمجھا جاتا ہے ایسے نوجوانوں میں سے ایک ڈاکٹر امبید کار تھے۔ وہ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے۔ اور وہ لاء کالج بمبئی کے پرنسپل بھی مقرر ہو گئے، بھارت میں وزیر قانون بھی رہے۔ تاہم وہ اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ وہ ہندوؤں میں شادی نہ کر سکے۔ وہ ہندو مندر میں نہ جا سکے وہ ہندو کے ساتھ مل کر کھانا نہ کھا سکے۔ انہوں نے اس صریح ظلم اور اس خطرناک سنگ دلی کے خلاف آواز بلند کی انہوں نے پبلک لیکچروں میں ہندومت کو غیر معقول بیان کیا اور اخباروں میں ایسی تحریریں شائع کیں جن سے ہندو قوم کا تعصب اور تنگ ظرفی طشت از بام ہوئی۔ مگر یہ سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ آخرش وہ بدھ مذہب اختیار کر کے اس جہان سے ہندو قوم کی کم ظرفی کا ماتم کرتے ہوئے رخصت ہو گئے یہودی قوم کا رنگ ڈھنگ بھی ہندوؤں کا سا ہے۔ یہودی بھی ہندو کی طرح یقین کرتا ہے کہ یہودی وہی ہے جو یہودی قوم میں پیدا ہوا ہو۔ دوسری قوم کا کوئی فرد یہودی نہیں قرار دیا جا سکتا یہودی قوم یقین کرتی ہے کہ یہوواہ صرف ہمارا ہی خدا ہے اور ہم ہی اس کی محبوب ترین قوم ہیں اور نجات صرف یہودیوں کے لئے ہی اور صرف یہودیوں میں ہی مذہبی راہنما و پیغمبر پیدا

ہوتے رہے ہیں۔ اور دوسری ہر قوم روحانی تعلیم سے محروم ہے۔ وہ آپس میں تلقین کرتے ہیں کہ یہودی کے سوائے دوسرے کسی شخص کے مذہبی نظریے کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے۔ قرآن کریم نے ان کے تعصبات کا ذکر کیا ہے یہودی کہتے ہیں:

نحن ابناء اللہ و احبائوہ

"ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور ہم ہی روحانی تعلیمات کے وارث ہیں" اس لئے وہ کہتے ہیں۔

لا تومنوا الا لمن تبع دینکم

یعنی کسی شخص کی بات پر کان نہ رکھو جو تمہارے دین کے سوا کوئی دوسرا اعتقاد رکھتا ہو۔ اور یہ بھی یقین نہ کرو کہ جو آسمانی کتاب نازل کی گئی ہے اس قسم کی کتاب کسی دوسری قوم کو بھی دی گئی ہے۔

ان یوتیٰ احد مثل ما اوتیتھم

حضرت عیسیٰ جو یہودیوں کے آخری پیغمبر ہیں ان کی انجیل میں یہی یہودی تعصبات کا رنگ ہے۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کو خدا کے سچے پیغمبر مانتے ہیں اور انکی دل سے تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور انکی کتاب یعنی انجیل شریف کو خدا کا کلام تسلیم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسیٰ اعلان کرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو تلقین فرمائی کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی باب ۱۰ آیت ۵)

اور شاگردوں کو یہ تلقین کی کہ پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔

حضرت عیسیٰ چونکہ یہودی قوم کے فرد تھے اور چونکہ انہوں نے یہودی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ بھی غیر یہودی سے نفرت کرتے تھے۔ اگر یہودی غیر یہودی کو کتے اور سور سے تشبیہ دیتے ہیں تو حضرت عیسیٰ نے بھی غیر یہودی کو کتے اور سور سے تشبیہ دی۔ چنانچہ انہوں نے ایک کنعانی عورت کو جو یہودی نہ تھی ذیل کے الفاظ سے مخاطب کیا۔

میں بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں پھینک سکتا اس پر اس عورت نے عرض کیا بچوں سے

دستر خوان سے جو ٹکرے گرتے ہیں انہیں کتے کھا ہی لیا کرتے ہیں (مرقس باب ۷ آیت ۲۷و۲۸)

حضرت عیسیٰ نے اس عورت کو محض اس لئے کتوں سے تشبیہ دی تھی کہ وہ یہودن نہ تھی۔ لیکن اس عوت کا کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کے مقابل پر نہایت درجہ کی انکساری اور تہذیب کا نمونہ ہے۔

جس طرح حضرت عیسیٰ کے مندرجہ بالا کلام میں تعصب پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا ذیل کلام ان کے تعصب اور تنگ ظرفی کی عکاسی کرتا ہے۔ " کہ نجات صرف یہودیوں کے لئے ہے "۔

غرض ہندوؤں اور یہودیوں کے اعتقادات دوسری قوموں کو ذلیل وحقیر اور قابل نفرت قرار دیتے ہیں۔ شام کے اسرائیلی اور ہندوستان کے ہندو آج اس بیسویں صدی میں اپنے اپنے غیر معقول اور مضر عقائد پر اصرار کے ساتھ قائم ہیں۔

اسی طرح اہل امریکہ نے حبشیوں سے ہر طرح کا ناروا برتاؤ کرنا اپنا شیوہ اور اپنا نسلی حق سمجھ رکھا ہے۔ اہل امریکہ پر نسلی فضیلت کا بھوت سوار ہے۔ اس لئے وہ حبشیوں سے ہر طرح کی بد سلوکی کرنا اور ان پر ظلم کرنا روا رکھتے ہیں۔ اہل امریکہ ذی علم قوم ہے باوجود اس علمی ترقی اور روشنی کے جو ان کو حاصل ہے۔ وہ نسلی فضیلت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور حبشیوں کو انسانی حقوق سے محروم رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ظلم اور ناروا سلوک سے حبشیوں میں آزادی کی تحریک پیدا کردی ہے۔ اور یہ تحریک اب طوفان کا رنگ اختیار کرگئی ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے دنیا میں امن قائم کرنے کی خاطر ایسی تعلیمات کی تلقین فرمائی جن کی برکت سے نسلی تعصبات اور دوسرے ہر نوع کے تعصبات ان کی عین حیات میں کافور ہو گئے۔ اور ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا اور عرب کے مختلف الخیال لوگ حضور ﷺ کی برکت سے شیر و شکر ہو گئے۔ آپ کا یہ کارنامہ زندہ جاوید معجزہ ہے۔

چھوٹا منہ بڑی بات

قدرت اللہ شہابؒ

میں نے اپنی زندگی میں چند دعاؤں اور اوراد وغیرہ کو انتہائی موثر، مجرب اور سودمند پایا ہے۔ میں اپنے ان ذاتی مشاہدات اور تجربات میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل سطور میں ان دعاؤں اور اوراد اور ان کو پڑھنے کے طریق کار کا ذکر ہوگا۔ جو میرے اپنے آزمودہ ہیں۔ ان میں کوئی نئی یا انوکھی بات تو نہیں لیکن میرا ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ ان میں عجیب وغریب سریع التاثیر خواص اور فوائد ہیں۔ ان کو پڑھنے کے لئے کسی سے کوئی اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ دین کے جملہ فرائض وواجبات کی پابندی سے ادائیگی لازمی ہے۔

(۱) نماز فجر کی سنتوں کے بعد اور فرضوں سے پہلے ۴۱ بار سورۃ فاتحہ، ہر بار **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** کے ساتھ پڑھی جائے۔ اول اور آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ اس کی بعد جو دعا مانگی جائے اس پر قبولیت کا خاص سایہ ہوگا۔ اگر ایسا چالیس روز تک متواتر کیا جائے تو بہت سی الجھی ہوئی حاجتیں سلجھ جاتی ہیں۔ اگر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لیا جائے تو اس کی برکت سے زندگی کے بہت سے بوجھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔

(۲) گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر سورۃ یٰسین پڑھی جائے۔ "ہر مبین" پر رک کر ہر بار بسم اللہ کے ساتھ سات بار سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔ سورۃ یٰسین ختم کرنے کے بعد پھر گیارہ مرتبہ درود شریف، اس کے بعد اپنی حاجت برآری کی دعا مانگی جائے۔ یہ تلاوت اس وقت تک ہر روز جاری رکھی جائے جب تک کہ دل میں اپنی حاجت کے بارے میں سکون یا اطمینان پیدا نہیں ہو جاتا۔

یوں بھی کسی خاص حاجت یا ضرورت کے بغیر ہر جمعہ کو ایکبار ایسا کرنا باعث برکت ہے۔ اور زندگی میں سہولت اور تازگی کے عناصر بڑھاتا ہے۔

(۳) گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر **اعوذ باللہ** اور **بسم اللہ** کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھنا شروع کرے۔ جب **ایاک نعبد وایاک نستعین** (ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد کی درخواست کرتے ہیں) پر پہنچے، تو رک جائے۔ اور اس آیت کو اللہ

تعالیٰ کے ننانوے ناموں کے ساتھ اس طرح دہرائے۔

ایاک نعبد وایاک نستعین یا اللہ یا رحمٰن

ایاک نعبد وایاک نستعین یا اللہ یا رحیم

اسی طرح ننانوے نام پورے کرے اور اس کے بعد سورۃ فاتحہ کا باقی حصہ پورا کرے۔ گردان اس طور پر کرے کہ جب **ایاک نعبد** کہے تو انتہائی خشوع کے ساتھ سجدہ میں چلا جائے۔ اور جب **ایاک نستعین** کہے تو اٹھ کر فقیروں کی طرح دامن پھیلا کر دل کی گہرائی سے ایسی لجاجت کے ساتھ یہ الفاظ ادا کرے کہ اپنے آپ پر رقت طاری ہو جائے۔ آیت کا یہ حصہ اور یا اللہ یا رحمٰن یا دوسرے اسمائے الٰہی ادا کرتے وقت ایسا انداز اختیار کرے جو خود اپنی نظر میں بھی واقعی فقیرانہ اور منکسرانہ ہو۔ ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ گھٹنوں کے بل نیم الیستادہ ہو کر کبھی اپنا دامن پھیلائے اور کبھی اپنی ٹوپی کفکول کی طرح ہاتھوں میں لے کر قادر مطلق کے حضور بڑھائے، اس آیت کے ساتھ اگر سجدہ اور پھر منگتوں کا سا انداز خلوص دل سے اختیار کیا جائے تو رفتہ رفتہ رقت خود بخود طاری ہونے لگتی ہے اور قرب کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی خاص مہم یا ہنگامی حاجت پیش نظر ہو تو موقع محل کے لحاظ سے اسماء الحسنیٰ میں سے اللہ تعالیٰ کا مناسب نام منتخب کر لے۔ اور مندرجہ بالا طریقہ سے اسے بار بار دہرانے میں اس طرح محو ہو جائے کہ اس کا اپنا وجود بھی فنا ہو جائے اور اس کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی اس خاص صفت کے علاوہ اور کسی چیز کا گزر نہ ہو۔ مثال کے طور پر

<u>وسعت رزق کے لئے</u>

ایاک نعبد وایاک نستعین یا اللہ یا رزاق

<u>یا بیماری کی صورت میں</u>

ایاک نعبد وایاک نستعین یا اللہ یا شافی یا سلام

اسی طرح باقی ضروریات کے لئے اسے بے شمار بار دہرائے۔ بعد ازاں سورۃ فاتحہ کا بقایا حصہ ختم کرے۔

میں چند ایک ایسے حضرات سے بھی واقف ہوں جنہوں نے کسی ہنگامی ضرورت کے تحت اس آیت کا ورد ایسے اضطرابانہ، اضطرارانہ اور گدایانہ انداز سے کیا کہ ایک ہی نشست میں ان کا

مطلب پورا ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سچے دل کے ساتھ اس ورد کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے تو وہ اسے اسی وقت ختم کرتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے یا اس کے دل پر اس بات کا سکون نازل ہو جاتا ہے کہ اس کا قبول نہ ہونا ہی اللہ کی رضا کے عین مطابق ہے۔ کوئی خاص حاجت نہ ہو تب بھی اس آیت کا پورے اسمائے الوہی کے ساتھ ہر روز ورنہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار کرتے رہنا کئی لحاظ سے باعث برکت ہے۔ خاص طور پر ایسا شخص دوسرے انسانوں سے خائف نہیں رہتا اور نہ ہی وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے۔ انسانی کردار کے یہ دونوں خصائل بڑی عظیم نعمت ہیں۔

(۴) گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد سورۃ اخلاص **قل هو الله احد** پڑھے۔ اس سورۃ کی دوسری آیت **الله الصمد** (اللہ بے نیاز ہے) کو پانچ سو بار دہرائے۔ پھر باقی سورۃ ختم کرے اور گیارہ مرتبہ درود شریف بھی پڑھے۔ اس سے دل میں سکون اور قناعت کو فروغ ملتا ہے۔ اور تنگدستی کا بوجھ بھی ہلکا ہو کر قابل برداشت ہو جاتا ہے۔

(۵) گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد سورۃ مزمل شروع کرے آیت نمبر ۹ جو لفظ "**وكيلاً**" پر ختم ہوتی ہے کو پڑھ کر رک جائے اور ۴۱ بار "**حسبنا الله ونعم الوكيل ٥**" (ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کر دینے کے لئے اچھا ہے) کا ورد کرے۔ اس کے بعد باقی سورۃ مزمل پوری کرے اور گیارہ بار درود شریف پڑھے۔ اگر ممکن ہو تو اس طریقہ سے سورۃ مزمل ہر روز گیارہ بار پڑھنے کا معمول بنا لے۔ ورنہ کم از کم ایک بار روزانہ پڑھتا رہے۔ اس معمول کو خلوص دل سے اپنانے سے زندگی اس قدر سہل اور سبک ہو جاتی ہے جس کا انسان کو خود بھی کبھی وہم و گمان نہیں ہوتا۔

(۶) امراض قلب میں دو قرآنی آیتیں خاص طور پر موثر اور مجرب ثابت ہوئی ہیں۔ ان آیات کو علاج اور دوائیوں کا نعم البدل سمجھنا شدید غلطی ہوگی۔ لیکن یہ امید ضرور رکھنی چاہیے کہ ان آیات کی برکت سے علاج میں نمایاں سہولت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ان دونوں آیات کو ہر نماز کے بعد جتنی بار آسانی سے ممکن ہو پڑھتے رہنا چاہیے۔ وہ دو آیات یہ ہیں۔

الذين امنوا وتطمئن قلوبهم بذكر الله ۔ الا بذكر الله

تطمئن القلوب٥

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے" (پارہ ۱۳، سورۃ الرعد۔ آیت ۲۸)

وننزل من القراٰن ما هو شفاء ورحمة للمومنين

"اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہے" (پارہ ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۲)

(۷) پارہ ۴ کی سورۃ آل عمران میں آیت نمبر ۱۷۳ کا آخری حصہ یہ ہے:

حسبنا الله ونعم الوكيل ٥ "ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے"

اگر کوئی شدید مشکلات، حاجات یا خطرات درپیش ہوں تو اس آیت کو ہر نماز کے بعد ۴۵۰ مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد **یا عزیز ، یا کافی ، یاقوی، یا لطیف** بھی ۴۵۰ بار پڑھے۔ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پھر اپنے مدعا کی دعا مانگ کر نتیجہ کے انتظار میں نہ رہے بلکہ نتیجہ خلوص دل سے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اگر ہر نماز کے بعد ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ایک نماز کے بعد اس معمول کو اپنا لے۔ اس میں اور بھی بہت سے خواص ہیں جن کا مشاہدہ پڑھنے والے کو اپنی استعداد، خلوص اور انہماک کے مطابق ہوتا ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام "**یا لطیف**" بھی ہے۔ لطیف لطف سے ہے جس کے معنی ہیں بندوں پر مہربانی کرنا۔ لطیف اس ذات کو کہا جاتا ہے جو تمام امور کی باریکیوں، حکمتوں اور اسرار سے واقف ہو۔ اور آنکھوں سے اس کا ادراک ممکن نہ ہو۔ اور جہت، جانب اور مکانیت سے پاک و منزہ ہو۔ جس کے لئے نہ حد ہو نہ انتہا۔ اور جس کا عقل و فہم ادراک نہ کر سکے۔ ان تمام صفات کے باوجود وہ ہر شے سے قریب ہو اور بندے کی مصیبتوں اور غموں کو جلد دور فرما دینے پر پورا پورا قادر ہو۔

ہر نماز کے بعد یا کم از کم ایک نماز کے بعد ۱۲۹ بار اس اسم مبارک کا ورد کرنا بہت سی مشکلات، مصائب اور غموں کا علاج ہے۔

اگر ہمت کر کے زندگی بھر میں صرف ایک بار ایک ہی نشست میں لگاتار اس اسم مبارک

۱۴۱ ۱۱ بار ورد کرلیا جائے تو انسان کی زندگی میں پریشانیوں، مصیبتوں اور غموں کا رخ موڑ نے اور انہیں آسانی سے برداشت کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم بڑھ جاتی ہے۔ اس ورد کے اول و آخر گیارہ یا اکیس یا اکتالیس مرتبہ درود شریف پڑھ لینا چاہیے۔

(۹) اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الحشر کا تیسرا رکوع، آیت نمبر ۱۸ سے لے کر سورۃ کے آخر تک (یعنی آیت نمبر ۲۴ تک) اس طرح پڑھیں۔ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ پھر **اعوذ باللہ** اور **بسم اللہ** کے ساتھ تیسرا رکوع پڑھنا شروع کریں۔ آیت نمبر ۲۱ میں جب ان الفاظ پر پہنچے تو یہاں پر پہنچ کر رک جائے۔

لو انزلنا هذا القرآن علىٰ جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله

"اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا"

ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد اپنی مشکل یا مصیبت کو تصور میں لائے اور انتہائی خلوص سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں التجا کرے کہ میری مشکل یا مصیبت ہی میرے لئے ایک پہاڑ ہے۔ اپنی قدرت سے قرآن حکیم کی اس تلاوت کے صدقے اس پہاڑ کو میرے لئے ریزہ ریزہ کردے۔

یہ دعا کرنے کے بعد آگے پڑھنا جاری رکھے۔ آخری آیت نمبر ۲۴ میں جب ان الفاظ پر پہنچے، تو انہیں پڑھ کر رک جائے۔

له الاسماء الحسنىٰ "اس کے اچھے اچھے نام ہیں"

الفاظ پڑھنے کے بعد رک کر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء الحسنیٰ کا ایک بار ورد کرے اور اس کے بعد آیت کا بقیہ حصہ پورا کرے۔ کسی خاص مشکل یا حاجت کے بغیر بھی اگر اس رکوع کو عام اور سادہ طور پر ہر روز کم از کم ایک بار پڑھنے کا معمول بنالیا جائے تو زندگی پر برکات اور بشاشت اور کشائش اور آسائش کی خاص برکات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ان چند دعاؤں کے علاوہ زندگی کے تقریباً نصف صدی پر محیط تجربات، مشاہدات اور قلبی واردات سے استفادہ کرکے ایک ایسی دعا مرتب ہوگئی ہے جو انسانی حاجات اور معاملات کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ میرے چند ثقہ دوستوں نے اسے اپنا کر اسے موثر اور مفید

پایا ہے۔

انہوں نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ضیاء القلوب میں "نماز کن فیکون" کا طریقہ دیکھ کر اصرار کیا کہ اس دعا کا نام بھی "دعائے کن فیکون" رکھ دیا جائے۔ مجھے اپنی عاجزانہ کوشش کے لئے یہ عنوان منتخب کرنے میں تردد تھا۔ کہاں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور کہاں یہ بندہ ضعیف و گناہگار۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لیکن دوستوں کا اصرار اس طرح جاری رہا کہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی پیروی میں محض حصول برکت کی خاطر یہ عنوان اس امید پر رکھا گیا ہے کہ شاید اس بندہ عاصی کی کوشش پر ان کی خوشنودی کا سایہ بھی پڑ جائے۔

ضروری اطلاع

☆ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے نواسے خواجہ منصور الحق رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں تمام برادران ان کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

☆ مرکز تعمیر ملت گوجرانوالہ کا فون نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔ برادران نوٹ فرمالیں۔

نیا نمبر 862835

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالےٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش و خروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت و ادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوا
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقو
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا او
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیا
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔